ہماری
لکھنؤ

یوم آزادی



ہر اکسلنسی دی گورنر یو۔پی۔
مسز سروجنی نائڈو

شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی
مولانا سید اولاد حسین صاحب شاعر

تبریک آزادی

درِ چمن سے ہٹے پاسباں مبارک باد
ہما کو مل گیا پھر آشیاں مبارک باد

پرند پوشِ فلک پرنیاں فروشِ چمن
ہے ایک رنگ، زمیں آسماں مبارک باد

جناح و نہرو و ارکانِ بزمِ شوریٰ کو
بہ حدِّ خاص جہاں بانیاں مبارک باد

ہے تختہ تختہ گلستاں مگر بہار تو ہے
گیا تو موسمِ خشکِ خزاں مبارک باد

بہ قطرہ قطرۂ دریائے گومتی تبریک
بہ ذرّہ ذرّۂ ہندوستاں مبارک باد

بہ بارگاہِ ستم دیدگانِ مُلکِ اودھ
زوالِ دولتِ افرنجیاں مبارک باد

قسم بہ خاکِ سلیمن[عله] کہ بے متاع و بساط
زیاں فروش چلا کارواں مبارک باد

جن استخوانوں میں تھے روزنِ خدنگِ ستم
بسانِ نےؔ ہیں وہی نغمہ خواں مبارک باد

بہ لفظِ شاعر و در لحنِ بُلبلِ شیراز
نوائے قیم بہ کرّو بیاں مبارک باد

"مشاعر"

عله اودھ کا وہ ریزیڈنٹ جو فسادِ اودھ کا باعث ہوا۔

قلم

آغاز داستان

اس عمر میں میرے گم شدہ کھلونوں کی بازیافت کھیل نہیں معجزہ ہے
چوں پیر شدی حامی در میکدہ بستر کن

گہوارے کی ڈوریوں کی جکڑ بندی سے آزاد ہو کر لکھنؤ کے منصۂ تعارف پر میں شعر لے کر آیا قلم کے پیچھے پیچھے چلتا رہا ۱۰ءمیں گویا پیمبر شعر و ادب تھا کہ میزان دے کر بھیجا گیا۔ پھر مسلم گزٹ میں وحید الدین صاحب سلیم مرحوم کی خدمت میں زانوئے تلمذ تہہ کیا ستارہ کا تا غروب ساتھ دیا۔ سفینہ خود تیرایا خود ہی ڈبویا روزنامۂ جدت کے عہد قدیم سے قلم کا زور زبان میں سما یا اکتوبر ۲۸ ۱۹ءمیں جس دام کو زور پرواز نے توڑا تھا ۴۳ءمیں پھر اسی دام و قفس سے سابقہ ہوا۔

سبزہ رنگے بخط سبز مرا کرد اسیر
دام ہم رنگ زمیں بود گرفتار شدیم

اگر انسان من مانی ہی کر سکتا تو کیا کیا نہ کرتا۔

ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

میرا ارادہ نہ تھا مگر مرید مطلق چاہتا تھا۔

"عرفت ربی بفسخ العزائم" میں نے اپنے خدا کو شکست عزم سے پہچانا ـــــ مگر جو کچھ ہوا اچھا ہی ہوا کم سے کم مجھے یہ معلوم ہوا کہ وفا ثمرۂ تعلیم نہیں نتیجۂ جہالت ہے

تعلیم یافتہ ہمیشہ غدار رہتا ہے اور ہر پڑھے لکھے کو غدار ہونا چاہیئے نیز مجھے یہ معلوم نہ ہوتا کہ پرہیزگار متقی و مقدس اصحاب بخاری و غداری خیانت فی الدین کا چلتا پھرتا ترجمہ ہیں ۱۹۴۳ء سے ۱۹۴۷ء تک میں جس مقدس کا منہ دیکھتا تھا وہ میری طرف سے منہ موڑتا تھا یہ اُس کتاب کے حاملین کا ذکر ہے جس کا جلی عنوان ہے وان احد من المشرکین استجارک فاجرہ (اے رسول اگر تم سے کوئی مشرک بھی پناہ مانگے تو اس کو پناہ دو) یہ واقعہ ہے کہ حاملین کتاب مجھے پناہ نہ دے سکے اور ساغر شراب والوں نے پناہ دی۔ گزشتہ چار سال میں میں نے پرانا حلقہ چھوڑ اور نئے مجالس میں داخلے کی کوشش کی اور اس میں اتنا کامیاب ہوا کہ آج ھمراھی کا پہلا نمبر آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں ہمراہی کا پس منظر یاس نہیں امید ہے ماہانہ ہمراہی کے بعد بہت جلد ہفتہ وار و روزانہ صحائف اُمنڈتے دیکھ رہا ہوں

سالک مسلک ایجاد ہوں مکڑی کی طرح
دل سے نئی راہیں نکالوں جو ذرا دل ٹھہرے
(ماہر لکھنوی)

مددگاروں کی تعداد اب اس قدر ہو چکی ہے کہ اگر سب کا ذکر کروں تو شاید ہمراہی کا پہلا نمبر کتاب الفہرست ہو جائے۔ ہاں خان بہادر عین الدین صاحب سابق دیوان دتیا۔ خورشید احمد صاحب چیف کمشنر دہلی کا شکریہ ادا نہ کرنا جرم ہے میرے پرانے احباب و اعزا میں سے اب کوئی میرے گرد و پیش نہیں ہے مگر اس حلقہ سے صرف ایک جواں مرد نکلا یعنی شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی جن کو ساتھ لے کر ہمراہی کا آغاز کر رہا ہوں ہم دونوں کے یہاں اظہار شکر و امتنان کا رواج نہیں ہے۔ آپ سے کچھ نہیں چاہتا۔ بس ہمراہی کی کمزوریوں سے مطلع کرتے رہیئے۔

چل رے خامے بسم اللہ

شاعر

بیکار سیاست

۱۸۵۷ء میں تحریک آزادی نے جب شہبازانہ پرواز اختیار کی تو ہر مفکر ملک میں ایک ایسی حکومت دیکھ رہا تھا جس میں جیل خانوں کی ضرورت نہ ہوگی جس میں کم قیمت اجناس کی ریل پیل ہوگی جہاں ہندو مسلم کی صرف اُسی وقت شناخت ہوگی جب ایک مسجد اور دوسرا مندر میں ہو۔

اب جب کہ آزادی حاصل ہو رہی ہے۔ یہ خواب بھی بدل گئے اور اس کی تعبیریں بھی، برطانیہ جو مفتوح قوموں کی تاریخ و نسل مٹانے، ملکی صناعوں کا خون کرنے، مکاری غداری نفاق انگیزی میں مشہور و معروف قوم ہے جس نے صرف دو سو برس میں ہندوستان کی صورت ہندوستانیوں کی سیرت روند ڈالی۔ ہمیں وہاں چھوڑ چلی ہے جہاں اُس نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے دانتوں سے تھاما تھا وہی خود مختار صوبہ داریاں ہیں وہی صوبوں میں چشمک و انتقامانہ جذبے ہیں۔ وہی والیان ملک، ہاں ایک چیز اور زیادہ ہوگئی ہے یعنی ہندو مسلم سوال جو اودھ کی سلطنت نے مٹا ڈالا تھا۔ اگر برطانیہ کو یہ امید ہو کہ وہ پھر ثالثی کا حق حاصل کر سکے گی تو غلط نہ ہوگا۔ ملک کے عام فسادات، گرانی، قحط، خوں ریزی، بدامنی ہر چیز چاہتی ہے کہ ہندو مسلم ہاتھ جوڑ کر برطانیہ سے عرض کریں۔

رواق منظر چشم من آشیانۂ تست
کرم نما و فرود آ کہ خانہ خانۂ تست

ہر اہل قلم کا فرض ہے کہ وہ ہندو مسلم اتحاد کا پرچار کرے مگر اختلاف عقلی تو بحث و مباحثے سے طے ہو سکتے ہیں۔ جب مسئلہ مونچھوں کا ہو جائے تو افلاطونیت بھی ہیچ ہے۔ پھر طرفین کے خود مختار و ذمہ دار و عہدہ داران میں بھی وہی خروش جذباتی پایا جاتا ہے جو سراج الدولہ و میر جعفر کے عہد میں تھا و ذمہ دار و ذمہ دار ایسی تقریریں کر رہے ہیں کہ گویا کوئی حکومت ہندوستان میں موجود ہی نہیں یا اشتعال انگیزی علاوہ بانسانی قانون کی زد سے باہر ہو چکا ہے ہم کو تو حیرت ہوتی ہے جب ہم یہ سنتے ہیں کہ چند اخباروں کی ضمانتیں ضبط کر لی گئیں دریافت طلب یہ ہے کہ کیا ذمہ داران حکومت کی تقریروں سے زیادہ ان میں کچھ گندھک کا مادہ پایا جاتا ہے۔ خدا رحم کرے۔

عکاسی

مصوری اس قدر قدیم فن ہے کہ ٹھیک ٹھیک زمانہ مقرر کرنا ایک مؤرخ کے لیے بھی دشوار ہے جس وقت تحریر کے لیے حروف موجود نہ تھے تصویر موجود تھی۔ مصور ایک عہد میں دیوتا سمجھا جاتا تھا۔ فوٹوگرافی نے اس فن کو سہل سے سہل تر کر دیا۔ حال ہی میں خطۂ ایجاد مغرب سے اعلان ہوا ہے کہ عنقریب ابھری تصویریں بھی عکاسی سے حاصل کی جا سکیں گی یعنی آپ اپنی تصویر سے مصافحہ و معانقہ بھی کر سکیں گے۔ آج کل ترقی یافتہ سوسائٹی سے لے کر عوام تک اس فن کے دلدادہ ہیں چاہے جیب میں پیسہ نہ ہو مگر گلے میں کیمرہ اکثر لٹکا ہوا نظر آتا ہے کوئی رسالہ مشکل ہی سے ایسا ہوگا جو تصاویر سے اپنی زینت نہ چاہتا ہو لیکن یہ تعجب ہے کہ فن عکاسی پر کبھی کچھ لکھا نہیں جاتا۔

ھمراھی اپنے صفحات میں ایک نیا باب عکاسی کے لیے مخصوص کر رہا ہے ظاہر ہے کہ کسی فن کے مثالب و محامد پر گہری نظر ڈالنے کے لیے چند صفحات کافی نہیں ہو سکتے لیکن بہ تشنگی سہی سیرابی تو ہے۔ ان صفحات کے لیے ایک نادر کار و ماہر فن کے خدمات حاصل کر لیے گئے ہیں اور وہ ان صفحات کے مطلق العنان مدیر ہوں گے۔

فنون لطیفہ کے مائلین کے لیے یہ زریں موقع ہے کہ وہ اپنے آرٹ سے نگارستان ہند کے صفحاتِ دردِ عبودا کی تزئین میں اضافہ کریں۔ یہ یوں ہی ہو سکتا ہے کہ آپ بہترین تصاویر ہمراہی میں اشاعت کے لیے بھیجیں جو مقابلۃً شائع ہوں گی جو اس قابل ہوں گی کہ رنگین شائع کی جائیں وہ بڑے صفحات پر رنگین شائع ہوں گی اور ادارہ ہمراہی ان کے لیے معاوضہ تو نہیں البتہ ہدیہ پیش کرنے سے بھی دریغ نہ کرے گا۔ اس طرح آپ کا کمال بام عروج تک جلد پہنچ سکے گا۔ ارادہ ہے کہ مقابلہ میں تیسرے نمبر تک انعام دیا جائے۔

مصوری پر آپ جو مضمون بھیجیں گے خوشخط ہو اصطلاحی انگریزی الفاظ کا اردو میں ترجمہ ضرور کا ہو مضمون کے ہمراہ جتنی تصویریں بھیجیں ان کی تعداد ضرور درج کیجیے۔

(ادارہ)

صحن قفس

(از باغبان)

الٰہ آباد و بنارس و کانپور و لکھنؤ کی میونسپلٹیوں نے اپنے ملازمین کے لیے ہندی لازم کردی ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے انگریزوں نے سات سمندر پار کی زبان لازم کردی تھی۔ مگر وہ ظلم تھا یہ عنایت انگریزوں سے مسلمانوں کا کوئی رشتہ ناتا نہ تھا اور اب جو کچھ ہو رہا ہے وہ برادران وطن کے ہاتھوں لیکن اُردو کو مرنے کی عادت نہیں ہے۔

ایک دوست نے پوچھا کہ وفاداری کی تعلیم مذاہب نے دی۔ حکومتوں نے دی، یہ غداری کا اسکول کہاں ہے جہاں سے طالب علم غدار بن کر نکلتے ہیں۔ ہم نے کہا کہ غداری کی تعلیم بھی وفاداری کے اسکولوں میں دی جاتی ہے۔ وفاداری کے پروفیسر کا نام قدر و عزت ہے اور غداری کے اُستاد کا نام ناقدری۔ کہنے لگے خدا جانے چودھری خلیق الزماں کو معلوم ہے یا نہیں۔

ایک دوست نے سوال کیا کہ ہندو مسلم فسادات سے جی گھبرا گیا۔ اس کا کوئی علاج ہے کہ یہ خون خرابہ بند ہو۔ ہم نے کہا کہ اس مرض کی دو دوائیں ہیں معلوم تھیں مگر ان میں سے ایک چین میں ناکام ثابت ہوئی۔ دوست نے کہا وہ کیا ہم نے کہا افیون خوری۔ چینی افیون کھانے پر بھی آپس میں لڑ رہے ہیں دوست نے کہا اور دوسری دوا میں نے کہا اگر ہندو مسلم دونوں شعر کہنے لگیں تو ممکن ہے لڑنے کی فرصت ملے

ہمارے چند دوست کمیونسٹ ہیں اُن کی خدمت میں بازار کے دو بھاؤ پیش ہیں سرمایہ دار سود خوار مہاجن دس روپیہ کی اُدگاہی دے کر سال بھر میں بارہ روپیہ لیتا ہے یعنی عین المال میں پانچویں حصّہ کا شریک اور مزدور ایک روپیہ کی لکڑی گھر تک لانے کے پانچ آنہ لیتا ہے یعنی عین المال میں تیسرے حصّہ کا شریک، مظلوم مزدور پر رونا چاہیے یا نہیں۔

دماغی کارٹون۔ ایک گھبرایا ہوا انگریز گرین لینڈ، آئس لینڈ امریکہ کے سپرد کرتا ہے اور روپیہ کی تھیلیاں جمع کرتا ہے۔ پھر کھوئے انگریز ہند ماتا کے سر پہ آزادی کا سہرا باندھ کر ڈولے میں بٹھاتا ہے۔ اس

ڈولے کا ایک ڈنڈا جو جواہر لال بالقابہ اور دوسرا ڈنڈا جناح بالقابہ کے کاندھے پر ہوتا ہے اور روپیہ کی تھیلیاں جہیز اٹھانے والوں مزدوروں کے سر پر ——— کیا بیٹی کی رخصتی یوں نہیں ہوتی۔

کہتے ہیں یہ داستان سازان و افسانہ تراش کہ فلاں صاحب کا چشم دید واقعہ ہے کہ مفلسی حد سے زیادہ بڑھ گئی تھی۔ ناگاہ ایک جوگی آیا اور اُس نے سوال کیا۔ مفلس الدولہ نے منہ بنا کر کہا بابا آج تین دن سے جیب سے لے کر تھیلی تک اور تھیلی سے لے کر چولھا تک خالی ہے۔ ہاں چلم پی لو۔ جوگی بیٹھ گیا اور اُس نے خود چلم بھری اور گنج اپنے پاس سے رکھ کر آگ رکھی اور دم لگا کر چلم چھوڑ چلا گیا۔ مفلس الدولہ نے جب دوبارہ چلم بھرنا چاہی تو گنج کی جگہ چلم سے سونے کی ٹکیا نکلی یہ نیا روپیہ جو آیا ہے ہم کو جوگی کا گنج معلوم ہوتا ہے۔ چلم میں رکھ کر دم لگانا شرط ہے کیا عجب ہے کہ کیمیا کا کوئی جزو اس میں شریک ہو اور سونے کی ٹکیہ ہاتھ آئے"

قند پارسی

آں سرو ناز بر لب بام ایستادہ کیست　　بر طرف آفتاب کلہ کج نہادہ کیست
گویند دل برائے چہ دادی بمہر او　　آں کس کہ دید شکل وی و دل ندادہ کیست
اے شیخ شہر چند ملامت کنی مرا　　بے ذوق جام و بادہ و معشوق سادہ کیست

از پا فتادہ جامی و آں شوخ سنگ دل
ہرگز نہ گفت بر سر ایں رہ فتادہ کیست



کس کو آئے گا یقیں یہ بات ہے بازار کی

کل ایک پیر زن میں گیر کنارہ گور سمجھ کر سڑک کی فٹ پیری پر پاؤں لٹکائے بیٹھا تھا۔ راشن کی دوکان کے قریب کہنے لگا کہ مصیبت ڈالنے والے اور مصیبت اُٹھانے والے بدلتے ہیں مصیبت نہیں بدلتی۔ شاہی میں روپیہ کا دو من غلہ تھا اور تنخواہ تین روپیہ اب دو سیر کا غلہ ہے اور تنخواہ سو روپیہ غریب جب بھی پیٹ پکڑے تھا اور اب بھی، چاہے ترقی کہو چاہے تنزل،

آپ کیا کہتے ہیں!



ادارۂ ہمراہی صرف ادب و شعر ہی نہیں شعور و دانش کی بھی خدمت کرنا چاہتا ہے مگر جس طرح جاہل زندگی تعلیم سے پہلی چیز ہے۔ اسی طرح مقبولیت عام شعور و شعر کی خدمت سے اول۔ معیاری رسائل زندہ ہی نہیں رہتے اور اگر مر مر کر جیے بھی تو سال میں چند ہچکیاں و ناغہ بعد از وقت اشاعت، لینا ہی پڑتی ہیں۔ لہذا استدراج و تدریج کی پناہ لینا واجب ہے۔ زیر نظر نمبر بالکل تو ادب لطیف نہیں ہے۔ مگر پھر بھی جتنی جھلک ہے وہ بھی ثقالت زدہ کہی جا سکے گی۔ خیر

دیدہ خواہد شد

ہاں یہ تو فرمائیے، ہمارے پرانے انداز تحریر کی حیات ثانیہ آپ کو پسند ہو گی یا آپ گڑے مُردے اکھاڑنا سمجھیں گے۔ ہمارے ادبیات کے بہت سے اجزا امتداد زمانہ کی تہوں میں دفن ہو گئے کیونکہ ہم پر اور ہمارے مذاق پر غیروں اور سمندر پار والوں کا دباؤ تھا جس کو ۱۵ اگست کی صبح نے پراگندہ کر دیا اب ہمارے جذبات ہمارے ہو کر ابھریں اور پروان چڑھیں گے کیا آپ کو پنڈت رتن ناتھ سرشار کا فسانہ آزاد اور اس کا خوجی پسند نہیں ہے۔ کیا آپ کو رجب علی بیگ سرور کی ملکہ مہر نگار و انجمن آرا کی مقفیٰ عبارت یاد نہیں ہے، کیا آپ کو اودھ پنچ فراموش ہو گیا

اگر ہمراہی ان تمام اندازوں کا تھوڑا تھوڑا حصہ ہر ماہ آپ کی مطالعہ میز پر پیش کرے تو آپ پسند کریں گے یا نہیں۔ لکھنؤ میں ابھی مخفی و گمنام ایسے اہل کمال باقی ہیں جو ان گل ہائے رنگا رنگ سے دامن نظارہ لبا سکتے ہیں۔

آپ کے جواب کا منتظر

ادارۂ ہمراہی



فراق و بنگال

(از شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی)

طاہر پیلس — شنکر سیٹھ روڈ

پونا، ۲۱ ۷/۴۷

بھائی صاحب، حیران ہوں رسالے کے واسطے کیا مضمون بھیجوں، دماغ ہواؤں میں اُڑ رہا ہے عقل نٹوں کی طرح ڈوری پر ناچ رہی ہے عجیب منحوس زمانہ ہے لیکن آپ کہیں گے زمانے پر سب و شتم نہیں چاہیئے ہاں نہیں چاہیئے۔ میں بھی آپ کا ہم نوا ہوں۔ جو کچھ ہو رہا ہے، موسم کی پیداوار ہے، بھیا یہ سب کچھ بھگتنا ہے اور اس دھارے کو چیر کر ساحل تک پہونچنا ہے۔

آپ کا

"جوش"

یہ شام خنک، یہ ابر افسردہ خرام ہستی کی نوید، اور نہ مستی کا پیام
گردوں پہ اک آہ سی ہے۔ لیکن موہوم دل پہ اک بوجھ سا ہے، لیکن گم نام

یہ نالۂ بے خروش کس سے کہیئے! یہ قصۂ درد، جوش، کس سے کہیئے
مکھڑے کی دمک ہے، اور نہ لہجے کی کھنک محرومئ چشم و گوش، کس سے کہیئے

پچھتائی ہوا زلف کی خوشبو بن کر ارماں کانپے فضا میں جگنو بن کر
دیکھا جو ترے ہجر میں سوئے انجم ٹپکی آنکھوں سے رات آنسو بن کر

نشے میں بھی آہ سرد بھرتا ہوں میں لمحات حیات میں بھی مرتا ہوں میں
اس بات کی تو گواہ رہنا شب غم ہر گھونٹ پر ان کو یاد کرتا ہوں میں

اے چشمۂ لالہ زار، دم بھر تو ٹھہر ابر سر کوہسار، دم بھر تو ٹھہر
اک آبلہ پا رواں ہے تیری جانب اے قافلۂ بہار، دم بھر تو ٹھہر

برسات ہے، دل کو ڈس رہا ہے پانی فرقت میں تری جھلس رہا ہے پانی
دل میں کبھی چبھتا ہے، کلیجے میں کبھی آڑا، ترچھا برس رہا ہے پانی

ٹپکاتی ہوئی گھٹا جب آنسو آئی فرقت کا جگاتی ہوئی جادو آئی
ہلکا ہلکا دھواں کلیجے سے اٹھا سوندھی سوندھی زمیں سے خوشبو آئی

آجا، مرتا ہوں غم کے مارے، آجا برسات کی راتوں کے سہارے آجا
اے شام کا وعدہ کرکے جانے والے اب ڈوب رہے ہیں دیکھ تارے آجا

شامِ اودھ کا آخری چراغاں

مولانا اولاد حسین صاحب شاؔعر نے اپنی مصروف زندگی میں بھی علمی و ادبی خدمات جاری رکھے خصوصاً فن تاریخ جس کا ذوق دائم رہا۔ شام اودھ کا آخری چراغاں یہ آپ کی ایک اہم و ضروری تصنیف ہے جو دلچسپ و دلکش بھی ہے۔ جس میں آپ نے اُن مشاہیر کا حال تحریر فرمایا ہے جن کو آپ نے اپنے بچپنے سے اس وقت تک دیکھا ہے۔ مولانا موصوف کے ادوارِ حیات بوقلموں رہی ہیں۔ آپ کی طبیعت ہمہ گیر ہے اس لیے اس تصنیف میں شعرا و علما و اطبا و ڈاکٹر امرا و والیان ملک و شہزادگان، واعظین کانگرس، کمیونسٹ مسلم لیگی، ہندو سنی و شیعہ انگریز یہودی ہر فرقہ و طبقہ کے اصحاب کا تذکرہ ہے اس تصنیف میں فنون کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اہل فن کی وجاہت و شہرت کا لحاظ نہیں کیا گیا ہے۔ ہمراہی میں پہلا سلسلہ شعرا کا پیش کیا جا رہا ہے اور امید ہے بہت جلد اس اہم تصنیف کو کتابی خلعت دے دیا جائے گا۔ (سب اڈیٹر)

انجم

نواب سید بہادر حسین خاں صاحب مرحوم انجمؔ سادات نیشاپور سے تھے آپ کے اجداد نیشاپور سے دہلی اور دہلی کے اجڑنے کے بعد پناہ گاہ لکھنؤ میں وارد ہوئے۔ خود فرماتے ہیں۔

لکھنؤ میں آئے انجم رہ کے دہلی میں بزرگ
ایک دن وہ تھا کہ اپنا شہر نیشاپور تھا

حکیم بندہ مہدی صاحب مرحوم جو اودھ کی وزارت تک جا پہنچے تھے انھیں کے خاندان سے انجم مرحوم بھی متعلق تھے۔ فروری ۱۹۲۰ء میں ایک ہونہار کمسن صاحبزادے افسر نواب صاحب قیصر لو راکھ ایک دختر کو چھوڑ کر انتقال کیا اور مقبرہ حکیم صاحب موصوف واقع گڈھیا چودھری امیں دفن ہوئے سن ولادت معلوم نہیں۔ ساٹھ برس کی عمر تھی اس لیے ۱۸۶۰ء سال ولادت سمجھنا چاہیئے۔

رعنا قد، چوڑا سینہ، گہرا گندمی رنگ، متوسط آنکھیں۔ قالب چڑھی گول ٹوپی۔ اچکن کے رومال کا سموسہ بنا ہوا کاندھے پر۔ اچکن کے بوتام میں گھڑی کا نقرئی چین اس میں بھی مختصر سا عطردان چھوٹی سی چاندی کی پنسل ہاتھ میں کئی کئی عقیق و فیروزہ کی انگوٹھیاں، ایک پتلی سی چھڑی۔ باغ قاضی میں رہتے تھے۔ منشی امیر مرحوم کے ارشد تلامذہ میں شمار تھا غالباً خود شاگرد بنانے کا شوق نہ تھا۔ یا ہم کو ان کا کوئی شاگرد یاد نہیں۔

غزل، مرثیہ، سلام، رباعی کہتے تھے آخر الذکر حصۂ کلام آخر عہد ہی میں شروع کیا تھا غالباً وقف حسین آباد میں بزمرۂ مرثیہ خوانان تقرر ہونے سے مرثیہ گوئی بھی اختیار کی تھی۔ ہم نے ان کو پڑھتے نہیں سنا ایک مثنوی بھی فرمائی تھی۔ ہم نے خود مرحوم کی زبان سے بعض اس کے حصے سنے تھے۔ اس مثنوی کو مرحوم کے افراط اہتمام نے شایع نہ ہونے دیا۔ مرحوم فوٹو گرافر بھی تھے اور لکھنؤ میں ممتاز حیثیت تھی، اپنے دوستوں کی تصویریں مفت کھینچا کرتے تھے اور مفت تقسیم کرتے تھے اور زیادہ جوش ولا غالب ہوا تو تاریخ بھی فرماتے تھے اور تصویر کے نیچے لکھ دیتے تھے۔ میری تصویر والد مرحوم کے ساتھ خود کھینچی تھی۔ آج والد مرحوم کی تصویر کا جو بلاک گاہ گاہ ان کی تصانیف کے سلسلہ میں شایع ہوا ہے۔ یہ انجم مرحوم ہی کی نشانی ہے۔ اس مثنوی کی تاریخیں لکھنؤ بھر کے شعراء سے کہلوائیں تھیں اور چاہتے تھے سب کے فوٹو بھی شایع کریں مالی اعتبار سے یہ ممکن نہ ہو سکا۔ امیر مرحوم کے خاندان تلمذ میں یہ خصوصیت اس عہد تک عام تھی کہ آپس میں نسبی اعزا کی طرح رشتے قائم کر لیتے تھے اور جو رشتہ قائم ہوتا تھا ویسا ہی احترام بھی ہوتا تھا۔ یہ خصوصیت ہم نے دوسرے اساتذہ کے شاگردوں میں نہیں دیکھی چونکہ خواجہ آتش مرحوم بھی مصحفی کے شاگرد اور امیر کے پیر بھائی تھے لہذا ناسخ مرحوم اور اُن کے تلامذہ سے خالص مالی اعتبار حسد و عناد طبیعت ثانیہ بن گیا تھا۔

ہم تو ہم والد مرحوم حضرت ذاخر لکھنوی ہمیشہ انجم کا احترام کرتے تھے اور انجم والد مرحوم کا احترام کرتے تھے۔ یہاں تک کہ صاحب سلامت خوف تقدیم سے چالیس قدم کے فاصلے سے اکثر ہو جایا کرتی تھی۔

ہم نے انجم مرحوم کو کبھی اپنے کلام کا کوئی حصہ بغرض اصلاح نہ دکھایا تھا مگر مشاعرے میں یہ موجود ہوں تو بغیر حصول اجازت پڑھ نہیں سکتے تھے۔ ہماری بھی جوانی تھی۔ اور ہماری شاعری کے بھی وہ دن تھے جب یہاں تک کہ سکتے ہیں یہ تصور کر لیا جاتا ہے کہ عجم میں فردوسی اور ہند میں میر و غالب ہمارے سامنے نقطۂ بے حرف ہیں۔

لکھنؤ میں جو اساتذہ اعلیٰ صف کے مانے جاتے تھے اُن سے مقابلے کی ہوس روزانہ تھی مگر بزرگوں کے

ڈر سے اس ذلت کو گوارا کرنا پڑتا تھا کہ حضرت افضل (امیر مرحوم کے چھوٹے صاحبزادے) سے دست بستہ اور حضرت انجم سے اُستاد عرض کرتا ہوں۔ کہکر غزل شروع کی جاتی تھی۔

راجہ نوشاد علی خاں صاحب مرحوم بڑے خلیق علم دوست بزرگ تھے میری شاعری پر حد سے زیادہ مہربان اُنھوں نے اپنی کوٹھی واقع چینی بازار (یہ کوٹھی اب راجہ صاحب جہانگیر آباد کی کوٹھی میں میراث نے ملا دی ہے) میں مشاعرہ کیا۔ راجہ صاحب بے چارے فربہ اندامی کے مریض تھے۔ وکٹوریہ اسٹریٹ تک گاڑی پر تشریف لائے اور مشاعرہ کا وعدہ لیا یہ فرما کر کہ بہترین غزل نہ ہوئی تو سال بھر تک بات نہ کروں گا۔ غالب مرحوم کی طرح تھی۔

ڈبویا ہم کو ہونے نے نہ ہوتے ہم تو کیا ہوتا

ہم نے غزل کہی اور بڑی محنت وفکر سے کہی اور چالیس پچاس شعر کی غزل کہی اس میں دس پندرہ شعر چنے اور یہ طے کر کے مشاعرے میں پہنچے کہ کسی کی کیا حقیقت ہے۔

یہ عہد لکھنؤ کا آخری عہد تھا بچے کھچے اہل کمال کوٹھی کے لمبے چبوترے پر حلقہ باندھے ہوئے بیٹھے تھے۔ وہ بزرگ بھی تھے جو مشاعروں میں جانے سے احتراز پسند کرنے لگے تھے۔ اور اب یہ چرچے چپکے چپکے ہوتے تھے کہ لکھنؤ سے تہذیب اُٹھ گئی۔ غضب خدا کا کہ تلامذہ صف اساتذہ میں آ بیٹھتے ہیں انگریزی الفاظ اُردو میں داخل کیے جا رہے ہیں۔ اندھیر ہے کہ کہا جاتا ہے اب فلاں کے پڑھنے کا نمبر ہے۔ صاحب ہم نے کرایہ کی گاڑیوں کے سوا انسان کا نمبر نہ دیکھا نہ سُنا۔

مشاعرہ کا چبوترہ اس قسم کے شعراء سے لبریز تھا افضل و ماہر و فاخر و عارف و رشید و رسا و فصاحت و شہرت غرض کون نہ تھا۔ بزم مشاعرہ کو مدن مان اور موتیوں کے پھولوں سے سجا گیا تھا ہر دم تازہ حقے اُن میں برف کی ڈلیوں کے ساتھ گلاب کی پنکھڑیاں پڑی ہوئی رقص کر رہی تھیں۔

کاغذی اور شالباف سے منڈھی ہوئی ہانڈیوں میں بستی اور سنگھی پانوں کی بیندا بند گلوریاں کیوڑے سے بسی ہوئی برف کی قفلیاں و آبخورے، فالسہ کا شربت فراشی پنکھوں کے سایہ میں چل رہا تھا ایک تازہ نشو تین بزرگ نے افضل مرحوم کے پہلو میں سگریٹ نوش فرما لیا۔ مرحوم وہاں سے اُٹھ کر راجہ صاحب کے پہلو میں آ بیٹھے۔ مگر سگریٹ نوش صاحب کو فوراً اپنی غلطی محسوس ہوئی اور معافی مانگ کر پھیر منا لائے تو

افضل مرحوم کہنے لگے۔ کہ مجھے تو یہ تعجب ہے کہ آپ لوگوں کو بدبو نہیں محسوس ہوئی۔ ہم نے حضرت افضل کے اٹھتے ہی اُنکی جگہ پر قبضہ کیا یہ وہی بدتمیزی تھی جو بلند حلقہ میں محسوس ہورہی تھی مگر ہم تو یہ طے کیے ہوئے تھے کہ ہم سے بہتر کسی کی غزل ہو ہی نہیں سکتی اس لیئے آخر میں نہ بیٹھتے تو کیا ابتدائی اصحاب کی صف میں بیٹھ جاتے۔

خدا خدا کر کے نو بجے اور راجہ نوشاد علی خاں صاحب مرحوم اپنے تن و توش کو چند بار ہمکا ہمکا کر کھڑے ہوئے اور تمام شرکا کو مخاطب کر کے فرمایا کہ حکم ہو تو مشاعرہ شروع ہو۔ سب نے یک زبان کہا۔ ہاں اب کیا دیر ہے۔ حکیم بارق فرمانے لگے کہ نو کے لگ بھگ وقت آگیا ہو گا۔ راجہ صاحب مرحوم نے اب حضرت فصاحت لکھنوی مرحوم کی طرف رُخ کیا اور دست بستہ غزل پڑھنے کی اجازت حاصل کی مرحوم راجہ صاحب فصاحت مرحوم کے شاگرد تھے۔

فصاحت مرحوم گفتگو میں حضرت کلیم اللہ کے پیرو تھے آپ نے رگ رگ کر اجازت دی اور راجہ صاحب نے غیر طرح غزل سے مشاعرہ شروع کیا۔ راجہ صاحب مرحوم نہایت خوشگو تھے۔ خوب تعریف ہوئی اس کے بعد بائیں ہاتھ سے دور شروع ہوا مگر خدا جانے کیا معصیت نازل تھی کہ ایک کے بعد ایک کی غزل مشاعرے کو ٹھس کرتی ہی چلی گئی۔ جتنا جتنا مشاعرہ پھیکا اور بے رنگ ہوتا جاتا تھا۔ ہم اپنے دل میں خوش ہو رہے تھے اور ان مونچھوں پر ہاتھ سے جاتے تھے جو ابھی نکلنے کی کوشش میں غرق تھیں ۲ بجے رات کے قریب جب شمع محفل اساتذہ کا مُنھ دیکھ رہی تھی دور سے حضرت انجم جنکے جو صاحب غزل پڑھنا چاہتے تھے انھوں نے غزل کی طرف سے آنکھیں ہٹا کر فرمایا۔ تشریف لائیے۔ مرحوم افضل فرمانے لگے بھئی دن کا بھولا رات کو آئے تو اس بھولے کو بھولا نہیں کہتے" یکتا فرمانے لگے اب آئے تو کیا فائدہ ہم تو بڑھے ہی سے تھے غرض انجم مرحوم سلام کرتے جواب دیتے مشاعرے کے حلقے میں آئے اور جب ہمارے قریب بیٹھنے لگے تو بادل ناخواستہ اپنے لئے جگہ دینی پڑی۔ مگر دل میں یہ بھی نقرہ دُہرالیا تھا کہ بیٹھئے دیکھا جائے گا۔

دور مشاعرہ چار بجے صبح کے قریب ہم تک پہنچا اور ہم نے حضرت افضل و انجم و فاخر و جاوید و دالد م سے پہلے بعد دیگرے اجازت لی اور غزل شروع کی جیسی ہم کو امید تھی ویسی ہی کامیابی بھی ہوئی مشاعرہ اڑ گیا خصوصاً کیا کا قافیہ جس پر بہت زور دیا گیا تھا اور اس قافیہ میں یہی یہ شعر۔

تماشہ جانتے تھے تم تو برق آہ سوزاں کو
کہو۔ اب ہم نہ سینے سے لگا لیتے تو کیا ہوتا

راجہ صاحب مرحوم نے بھی بہت تعریف فرمائی اور ہم تو یہ سمجھ ہی گئے کہ چراغ گل کر دیا۔ ہمارے بعد انجم مرحوم تھے اُن کے پاس شمع آئی۔ مرحوم نے فرمایا کہ مجھے پہنچنے میں بڑی تاخیر ہو گئی بہت سے حضرات پڑھ چکے جن کے سُننے کا مجھے بھی اشتیاق تھا لہذا مجھکو معاف فرمایا جائے۔ یکتا مرحوم نے پکار کر کہا کہ ہم بدلہ نہ لیں گے آپ کی غزل ضرور سُنیں گے۔ پھر مرحوم نے فرمایا میں ایسی ضروریات میں مبتلا تھا کہ غزل بھی نہ کہہ سکا راستے میں تین شعر عرض کیے ہیں۔ وہ کیا عرض کروں افضل مرحوم نے ہنس کر فرمایا کہ پڑھ کر تو دیکھئے فصاحت بولے ہاں مگر یہ ضروری ہی۔ ہم اور تن گیے کہ اس بے فکرہ سے کہے ہوے تین شعر کس گنتی میں ہیں۔ ہم نے بھی اصرار کیا مگر یہ سمجھ کر کہ پڑھیئے تاکہ ہمارے بعد بیٹھنے کا مزا معلوم ہو

مرحوم نے گھڑی نکال کر وقت دیکھا، کاندھے کا رومال پھر سے اوڑھا۔ ٹوپی درست کی۔ یک زانو نشست بدلی اور ترنم میں نہیں سادے لہجہ میں جس پہ ہزار ترنم تصدق آپ نے مطلع پڑھا۔ مرحوم پڑھنے میں ہاتھ کے اشاروں سے بتاتے بھی جاتے تھے۔

مطلع چلا مگر نہ ایسا کہ ہم کو اپنی ہمہ گیر غزل کا خطرہ محسوس ہوتا۔ دوسرا شعر بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ ناگاہ تیسرا شعر پڑھا گیا۔

مری میت پہ اب آیا ہی ظالم بال بکھرائے
کہو یہ شکل جیتے جی دکھا دیتا تو کیا ہوتا

اس شعر نے قیامت بپا کر دی بیس پچیس مرتبہ پڑھوایا گیا اور ختم مشاعرہ پر جو بھی مشاعرہ سے نکلا اُس کو ہماری غزل کا ایک حرف یاد نہ تھا اور مرحوم کا یہی شعر پڑھتا چلا جاتا تھا۔ مرحوم کے وہ شعر جو مجھے یاد ہیں۔

اُف ری تاثیر جذب کامل کی — شمع میں آگ لگ گئی دل کی

دیوانگان عشق کی بخشش عذاب ہے — پیدا کہاں بہشت میں صحرا کرے کوئی

تیر دل میں، سوز سینے میں ہی، سودا سر میں ہی — اپنے اپنے گھر کا مالک اپنے اپنے گھر میں ہی

تم تو کہدیتے ہو یہ سہل سے گھر جاتے ہیں — ہم پہ مشکل یہ گذرتی ہی کہ مرجاتے ہیں

سڑبلّی بیگم

(از عظمت تھانوی)

میں نے کہا۔ دیکھو بیوی تابعداری کی حد ہو چکی اب مجھ سے نباہ نہ ہو گا

بیوی بولیں۔ نباہ نہ ہو گا تو پھر گھر تباہ ہو گا

میں نے کہا۔ سب مجھے منظور ہے

اس ہفتہ میں دوسرا نکاح کر کے نہ دکھایا تو عظمت نہ کہنا۔

بیوی نے کہا۔ اے ڈراتے کس کو ہو اللہ کرے ہفتہ میں سات کر ڈالو کون لونڈوں ہی جو تم ایسوں کو لپیٹے گی۔ اگر شرافت علی خاں کے بیٹے ہو تو اب نکاح کر کے آنا نہیں تو منہ نہ دکھانا۔

میں نے کہا۔ دیکھئے دادی اماں دیکھئے۔ ابا مرحوم کا نام لے رہی ہیں۔

ہماری دادی۔ جن کا سر ہلتا تھا اپنی بٹیر کو دانہ کھلا رہی تھیں (مرحومہ کو یہ شوق مرتے دم تک رہا) کہنے لگیں۔ دولہن۔ دولہن تم کو کیا ہو گیا ہے۔ بہو بیٹیوں کی زبان ایسی ہی ہوتی ہے۔ لے اس مرنے والے شرافت علی خاں کا کیا ذکر تھا۔

بیوی بولیں۔ ہم تو یوں ہی کہیں گے جس سے سنا جائے سنے ورنہ ڈربہ خالی کرے۔

جب میں گھر سے چلنے لگا تو میری دونوں لڑکیاں صغریٰ کبریٰ جو اب جوان ہو چکی تھیں مجھے روکنے کو دوڑیں مگر میں بھی انجام سوچے بغیر بگڑ گیا تھا۔ لڑکیوں کو ریلتا چھوڑ کر یوں نکل گیا جیسے مرد کی غیرت کا اکیلا میں ہی وارث ہوں

——— (۲) ———

گھر سے نکل آنا تو سہل تھا۔ مگر ساری جائداد بیوی کی تھی اور حقیقت تو یہ ہے کہ ہم ایک ملازم قسم کے شوہر تھے دیتے کیا معنی ہیں اس اگست ۱۹۴۷ء تک تو ہیں روٹی کپڑا سب بیوی کا دیا ہوا۔ چوک میں اگرچہ ہم یوں ہی خرچ کرتے ہیں۔ جیسے والد مرحوم کوئی جائداد چھوڑ گئے ہیں مگر حقیقت یہی ہے کہ حیلوں بہانوں سے چوک جانے کا خرچ بھی بیوی ہی سے ملتا تھا۔ رہا چوک کا آنا جانا وہ بند ہی کیونکر ہو سکتا تھا۔ خاندان بھر کی وضعداری کی کفالت ہم پر منحصر تھی۔

خوش قسمتی کہ گھر سے نکلتے ہی شگون مل گیا سینڈ بیچنے والی جدن کی رازدار نوکر تھی اور اس نے بھی وہی بات کہی جس کی گویا میں دعائیں مانگ رہا تھا یعنی جدن بلا رہی ہیں بلا حیل حجت فوراً بلکہ فوراً سے بھی پیشتر چل دیا۔

میں نے دل میں کہا چلو یہ مسئلہ حل ہو گیا کہ ہم کہاں جائیں۔ آخر جدّن کو پرسوں ہی شادی اماں کے وہ کڑے دیئے ہیں جو انھوں نے مرنے سے لے کر چالیسویں تک کے اخراجات کے لیے حساب کر کے جدا جدا رکھے تھے۔

یار اگر پاندان کا تو اکھول کر دیکھا گیا تو کیا ہو گا۔ ہو گا کیا۔ پکانے والی نئی نوکر ہوئی ہی بات کو اپنے گھر بھی جاتی ہو ہمارے اشاروں کو یوں آیا گیا کر دیتی ہو جیسے معنی ہی نہیں سمجھتی اسی پر الزام آئے گا۔ اور جب ہم خود شبہ ظاہر کریں گے تو کس کو یقین نہ آئے گا اور فی الحال انہیں کڑوں کا بھپت سے روٹی چلے گی کیا بطور مہمان بھی دو روز کا کھانا نہ لے گا اتنے عرصہ میں دادی اماں رو رو کر جان دیں گی لڑکیاں مرنے سے پہلے یوں زانو بیٹھیں گی جیسے خدا نہ کرے ہم دنیا سے سدھار گئے۔ کسی محلّے والے کو رحم آ ہی جائے گا اور ہم یوں تنے ہوئے جائیں گے کہ خدا کی قسم فقط مرزا صاحب کے کہنے سے چلا آیا ورنہ فلاں رشتہ کے سلسلے میں پریس منیجر کے عوض پانچسو کی تنخواہ ملے تھی اور منیجر صاحب کی بہن سے نکاح گھاتے ہیں۔

—— (۳) ——

جدّن بڑی گھاگ تھی صورت دیکھتے ہی بولی نواب خیریت تو ہو جیسے کسی سے لڑتے ہوئے آ رہے ہو میں نے غصّہ سے کہا کون حرامزادہ نواب ہو وثیقہ داروں میں شادی کرنے کے لیے والد مرحوم نے نواب دولت جنگ سے رشتہ لا دیا تھا۔ ورنہ دادا مرحوم گورکھپور کے مشہور تمخیرے تھے جس زمانے میں اناس کا جو سیر ا۸ سیر بکتا تھا۔

جدّن نے قہقہہ لگا کر کہا یہ باتیں غصّہ مجھ پر کیوں استعمال ہو رہا ہے۔

میں نے کہا اس لیے کہ صبح صبح بلوا بھیجتی ہو اور وہ بھی نادری حکم فوراً آؤ ابھی آؤ۔ بیوی نے دسترخوان بچھایا ہی تھا کہ شگوفہ پہنچ گئی ہاتھ کا نوالہ رکھ کر چلا آیا۔

جدّن نے کہا تو پھر کھانا تو یہاں بھی تیار رہے۔

میں نے کہا کھانا کہاں نہیں مگر اس وقت تو خیراتی کے یہاں کی پوریاں۔ مفتی گنج کی بالائی۔ علی حسین کے یہاں کی نہاری۔ ٹنڈے کے یہاں کے کباب۔ دولارے کے یہاں کی امرتیاں چھوڑنا پڑیں۔ خیر لاؤ جو کچھ ہو منگوالو۔

جدّن نے فوراً روپیہ نکالے اور تبّن تبّن اپنے دونوں استادوں کو دوڑا کر ہر وہ چیز منگوائی جو اوپر کی فہرست میں درج ہے اور ہم نے خدا کا شکر کر کے کھانا شروع کر دیا۔ اور نہ کھاتے تو کیا کرتے۔

—— (۴) ——

کھانے کے بعد آنکھیں کھلیں بیوی کے سر کی قسم جدّن کیا تھی بس دو پائی تھی دو ہائی۔ اس کے بال تو خیر شہر بھر میں مشہور تھے اتنے لمبے کہ اودھ سے بنگال تک پھیل جائیں

مگر وہ گندھا یا ہوا پنڈا وہ بھرے بھرے بازو اُن کھُلی
میں نشتر چھپریاں، ہونٹوں پر چالیس کبوتروں کا خون
میں پھر سے ایک بار مرشا یہ بھی پوچھنا بھول گیا کہ
بلایا کیوں تھا اور مصلحت بھی یہی تھی کیونکہ جدّن اگر
کوئی نئی فرمائش کر دیتی تو مُنھ کی کھانا پڑتی۔ ہماری
ساری جائداد تو بیوی نے بہ صیغہ کورٹ آف وارڈس
دبا لی تھی۔ ننّھ منّی کو ہٹا کر راز کی باتیں
شروع کر دیں۔ پھر ڈُڈا ڈُڈا ڈُڈا ڈُڈا ڈا۔ آخر وہ
بولی نواب کل سے کہاں غائب تھے۔

میں نے سوچا کہ بات چھپانا ٹھیک نہیں ساری
روئداد کہہ ڈالوں اور آخر میں بتا دوں کہ اب دو
تین دن تمھارا مہمان ہوں نیز آئندہ کے لیے صلاح
و مشورہ کر لوں ایک سے دو کی رائے اچھی ہوتی ہے۔

میں نے کہا غائب کہاں تھے۔ پرسوں جو بات بھر
تمھارے یہاں حاضر رہے تو بیوی سنک گئیں اور گھر سے
نکلنے کی ممانعت ہو گئی۔ آج آنے کا ارادہ کیا تو گھر میں
قیامت برپا ہو گئی یہاں تک کہ ہم کو وہ دھمکی استعمال کرنا
پڑی جو مرد بالکل آخر میں دے سکتا تھا۔

جدّن بولی یعنی

میں نے کہا یہی سوت لے آنے کی دھمکی لیکن اثر اُلٹا
ہوا میں نے ایک کی دھمکی دی وہ بولیں کہ اس ہفتہ
میں سات نہ کر دو تو شرافت علی خاں کے بیٹے نہیں لہٰذا
ہم تنتے ہوئے چلے آئے جدّن خوب ہنسی اور پھر بولی
کہ چلے تو آئے اب کیا ارادہ ہے۔

میں نے کہا سُنو میرے پاس تو کفن کے لیے بھی ٹکا
نہیں ہے دو ایک روز تمھارا مہمان ہوں پھر یقین
ہے کہ دادی جان میرے لیے بین کریں گی لڑکیاں روئیں
گی محلّے والوں میں کوئی اللہ کا بندہ ترس کھا کر اُٹھ کھڑا
ہوگا صلح کرا دے گا اور فرض کر دیہ بھی نہ ہوا تو شہر میں
معززین کی کمی ہے نہ بے وقوفوں کی اور کوئی موٹا سا
سفارشی بہم کر لیا جائے گا۔

جدّن نے کہا اور بیگم نے کہہ دیا کہ سات کر لاؤ۔

میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا کہ ہاں اگر میں جیب در ہوتا
تو شاید وہ چودہ تک بھاؤ بڑھا دیتیں۔ کیونکہ اُن
کے تیور بالکل ہی ویسے تھے جیسے نیلام میں اناڑی خریدار

جدّن کہہ دینے کی اور بات ہے اونٹ تب ہی تک
بلبلاتا ہے جب تک پہاڑ کے نیچے نہیں آتا۔

اتنے میں استاد کے غلط بانہ والا نائی نے آکر
ہماری بات کاٹ دی۔

جدّن نے اپنی تقریر کا آخری فقرہ میرے کان میں
کہا۔ مجھے ہنسی آگئی۔

پھر جدّن نے نائی سے کہا ذرا نواب کا یہ ہونٹوں کا ال

نکھی تو استرے سے اڑادے ہم کو داڑھی مونچھیں رکھنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا تھا۔ ہاں عین ناک کے نیچے بڑی مونچھوں کا ایک چھوٹا سا مزار بنا رکھا تھا۔

نائی نے مونچھیں صاف کردیں

جدّن نے کہا نہ کسی کے رحم کھانے کی ضرورت نہ سفارش کی حاجت ابھی فیصلہ ہوا جاتا ہے۔ ذرا کمرے میں تو چلنا۔

میں کمرے میں چلا گیا۔

(۵)

لڑائی کی دوسری صبح تھی کہ ہمارے گھر پر جب کہ ہم غیر حاضر تھے کہاروں نے ایک فنس رکھتے ہوئے آواز دی۔ سواری اُتروا لیجئے۔

نئی پکانے والی بولی۔ سواری کہاں سے آئی ہے

کہاروں نے کہا چاول والی گلی سے۔

دادی اماں نے ہلتے ہوئے سر کو ڈیوڑھی کی طرف موڑ کر کہا کہ چاول والی گلی وہ تو رنڈیوں کا محلہ ہے وہاں والوں کی یہاں دال نہ گلے گی آنے والی سے کہدے کہ کہ بیوی خشکہ کھاؤ۔

بیوی بولیں۔ ذرا ٹھیک سے پوچھ تو کیا چاول والی گلی میں کسی شریف کا گھر نہیں۔

ماما پھر چلائی۔ سواری کہاں سے لائے ہو

کہاروں نے کہا۔ کہہ تو دیا چاول والی گلی سے جہاں کل نواب کا نکاح ہوا ہے۔ چھوٹی دولہن آئی ہیں۔

چھوٹی دولہن۔

دادی اماں کے دل پر ایسا دھچکا پڑا کہ ہلتی ہوئی گردن رک گئی اور بولیں ارے کیا۔

بیوی نے ایک چیخ ماری اور دوسری چیخ کے ساتھ آنسو آ گئے جیسے پڑوس ہی میں رہتے ہوں اور تیسری چیخ پر اُٹھ کر خود کوٹھے پر جا پہنچیں اور کوٹھے کا دروازہ بند کرکے مسلسل ہوں۔ ہوں۔ ہوں

[illegible] بھنائی [illegible] اب دولہن کو اُتروا لینے کون جائے دادی اماں کی گردن ہلتی ہے۔ وہ خود ہلا [illegible] نہیں سکتیں پھر بڑی بہو سے بگاڑے کون۔

دادی اماں کی روٹی ہمارے صدقے میں ہماری روٹی بیوی کی جائداد کے صدقے میں۔

نئی ماما کو دیکھئے بیوی کی طرف دوڑ کر بولیں نالے میں پھینک آؤ یا جہاں نواب ہوں وہاں لے جاؤ۔

کبریٰ بولی۔ اے واہ جب ابا جان نے نکاح کر لیا تو وہ بھی ہماری امی ہوئیں۔

صغریٰ نے دانت نکال کر چپکے سے بہن سے کہا ارے وہ تو دولہن بنی آئی ہوں گی۔

کبریٰ نے کہا مگر ہماری امی جان جوتے ماریں گی۔

صغریٰ نے جھانک کر تو دیکھ ہی لیں۔

دونوں لڑکیاں آئیں۔ قنس کا پردہ اٹھا دولہن گویا منتظر ہی بیٹھی تھی۔ لمبا سا گھونگھٹ نکالے فوراً اتر آئی اور دونوں لڑکیوں کے کاندھے پر اس زور سے بازو رکھ دیے کہ لڑکیاں دولہن کے دباؤ پر پیچھے ہٹنے لگیں اور دولہن مٹر مٹر بڑھنے لگی ڈیوڑھی سے صحن اور صحن سے دالان اور دالان سے خاص ہمارے بستر اور ہماری بیوی کی مسہری پر آ بیٹھی۔

دادی اماں کو دولہن نے ادب سے سلام کیا۔

دادی اماں کچھ گو میاں نہ کھیلے تھیں۔ پہلی کی روٹھیوں کا ڈر دوسری کی جوتیوں کا خطرہ انھوں نے کوٹھے کی طرف دیکھ کر چپکے سے کہا جیتی رہو۔ سہاگ قائم رہے۔

اب تو نئی ماما بھی اٹھی اور دولہن سے ذرا دور فاصلے پر کھڑی ہو کر دوپٹہ ہونٹوں پر رکھ کر یوں دیکھنے لگی گویا الہ آباد کی نمائش میں پہلا ہوائی جہاز آیا ہے۔

دولہن سر جھکائے بیٹھی رہی گھنٹہ دو گھنٹہ تین گھنٹہ، گھر میں سکوت تھا اور کوٹھے پر جنتیوں کی آوازیں۔

اب تو دشمنوں کے دل میں ٹھنڈک پڑی۔ اس بڑھیا ڈھنڈو کے گھر گھی کے چراغ جلیں گے دوسری بہو آگئی اب تو چین آگیا۔ میں نے اپنی زندگی مٹائی۔ دھن دولت مردوں کو کھلایا کیے میں خود سوکی سوکھے میں ان کو سلایا۔ اُس کی یہ سزا ملا ہوں۔ ہوں ہوا)

پڑوسی بھی جمع ہو گئے۔ ایک بولی نواب کو یہ نہ چاہیے تھا۔ لڑائی جھگڑا کس گھر میں نہیں ہوتی۔ مگر کوئی یوں دوسری کر لیتا ہے۔ دوسری بولی مگر نہیں میں نے بیگم کو ہمیشہ سمجھایا کہ مرد سے زبان نہ لڑایا کرو۔ دادی اماں نے اپنے سر کو اور دو جھکولے دے کر کہا کل بھی میں نے کہا کہ بہو بیٹیوں کی زبان اختیار کرو آخر وہ بچہ سہی مرد صورت تو ہے دوسری کر لایا۔

ایک چلتی پڑوسن جن کو دولہن دیکھنے کا بہت اشتیاق تھا کہنے لگیں لوگوں دولہن بے حیا ہے کیا خطا ہے جو اس کو باندھ کر بٹھا رکھا ہے وہ بے حیا ری تو ایک ہوں کہنے کی گنہگار ہے۔

اتنے میں کسی نے آواز دی خوان والے میاں خوان

دادی اماں نے اپنی ٹھیر کو مٹھی میں دباتے ہوئے کہا اب کھانا کہاں سے آیا۔ اری او مردار نئی ماما! ذرا دیکھ تو۔

نئی ماما دوڑ کر گئی اور سر پر خوان رکھے ملی صحن ہی سے بڑبڑاتی ہوئی انھیں دولہن کے گھر سے کھانا آیا ہے۔

نئی ماما نے بغیر کہے دولہن کے سامنے خوان رکھ دیا

دولہن نے تو خوان کھولا۔ ایک پلیٹ میں پایا

دوسری میں زردہ - تین رنگ کے سالن - دو قشتریاں
ایک چار دو مرتبہ ایک نمبر تھا - میں پانچ ٹکیاں کباب کی
دوسری میں آدھ پاؤ بالائی، شیرمال، پوریاں
دولھن نے خوان تو کھول لیا مگر ہاتھ کھینچ کر بیٹھ گئی
وہی پڑوسن جو دولھن کے دیکھنے کے لیے گویا
مری جا رہی تھیں - اے ہے نگوڑی نے آخر تو دو خوان
کھولا - اب کوئی منہ سے یہ بھی نہیں کہتا کہ بیوی کھاؤ
دولھن آہستہ آہستہ سے بولی میں نہ کھاؤں گی میری
باجی جان کو بلاؤ (کونے کی طرف اشارہ کرکے)

بیوی سن رہی تھیں چیخ کر بولیں تیری باجی جان
کے منہ کو جھلسا، تیری باجی جان کو موت - تیری باجی جان
آدھی رات کو مرے، پچھلے پہر تک جنازہ جائے -

دولھن جو جا ہو - کہیئے میں تو آپ کی لونڈی بن
کر رہوں گی - بے آپ کے نہ کھانا کھاؤں نہ پانی پیوں

بیوی - ہاں ہاں فاقہ کرکے مر جا اور ہاتھوں
میں ہتھکڑیاں ڈلوا -

دولھن - امی نے فنس پر سوار کرتے کرتے کہا
تھا کہ دیکھ بنو میں نواب کو نہیں بیگم کو لونڈی دے رہی ہوں

بیوی - مریں تیری امی بیگم کو لونڈی دینے والی
لونڈی کا کام جھاڑو دینا ہے اور تو اس گھر کو جھاڑو
دے کر صاف کرنے ہی تو آئی ہے -

وہی پڑوسن - دولہن سے قریب ہو کر لے بیوی تم
تم کھاؤ - اب تو ساتھ ساتھ رہنا سہنا ہے آج نہیں تو
کل کھالیں گی لے اب ذرا گھونگھٹ تو اٹھاؤ -

بیوی - ہاں ہمارے دشمن کھلتے جاتے ہیں پڑوسن
بہن سے جیسے پہلے کی جان پہچان تھی یہ کہکر بیوی نے
زور زور سے سینہ پیٹنا شروع کیا -

اتنے میں پڑوسن نے گھونگھٹ الٹا اور بیوی سے
بھی زیادہ لمبی چیخ لگا کر بھاگیں -

اے باجی - اے باجی تم نہ رو - اے یہ تو خود دولھا
بھائی ہیں -

ہم نے دیکھا کہ بات کھل ہی گئی تو بسم اللہ کہہ کر
اٹھے اور بیوی جو کوٹھے سے جھانک رہی تھیں ان کی طرف
دیکھ کر کہا سنا آپ نے فقط ایک کے لانے میں یہ ہوتا
ہے - سات آتیں تو کیا ہوتا -

لکھنؤ کا رمضان
اور افسانے کی زبان

محترمہ منیرہ بیگم نکہتؔ

دُرموئی

نواب جہاں نے اپنی خانہ زاد ماما کو ڈانٹا دُرموئی اب جو مُنھ سے نکالا کہ خدائی مہینہ آگیا تو مُنھ لال کردوں گی - اب ہی مسلم لیگ کا مہینہ، کانگریس کا مہینہ، اُن کا مہینہ جو لال جھنڈے دکھاتے پھرتے ہیں (ماتھے پر ہاتھ مار کر) "ہائے ہے" مجھکو تو بدنصیبوں کا نام بھی نہیں آتا وہ جو روس والوں کے پٹھو کہلاتے ہیں۔

ماما گلی کی مسجد میں مُلّاجی نے اپنی آنکھ سے اوپر والا (چاند) دیکھا ہے، اب چاہے رمضان آئے یا نہ آئے۔

نواب جہاں اے ایک اوپر والے ہی کے ہونے سے رمضان شریف آجاتا ہے۔ اے وہ بے چارے شریف میاں ہمارے لکھنؤ کی حالت جانتے ہیں - وہ کیوں آنے لگے، اس اُجڑی نگری میں، اب کیا رکھا ہے، سُنتی ہوں کل بھی اخبار میں نکلا تھا کہ گیہوں کا راشن اور کم ہو گیا ہے۔

ماما بیوی جان میں قربان تو کیا روزے نہ رکھو گی۔

نواب جہاں جب ہماری شاہی تھی ہمارے نوابی تھی تو مہینہ ہی بھر کے روزے تھے۔ اب اللہ نے چاہا تو پورے سال بھر کے روزے رکھنا پڑیں گے جانِ عالم[1] ہوتے تو لوگ کہتے بدانتظامی ہے گھر چھین لو، ملک سے نکال دو۔ اب کوئی نہیں بولتا جیسے مردوں کے حلق میں چھوہارا نکل آیا ہے۔ مغلانی بوا (جو بجری ڈلی کتر رہی تھیں) سچ ہے اب کسی چیز میں مزا نہیں پھر بھی اللہ کا حکم ہے روزے رکھنا ہی پڑیں گے چاہے رُو رکھے ہوں چاہے پھیکے۔

نواب جہاں وہ تم رکھنا مجھے مذہب میں بھی خرانٹ پن نہیں بھاتا۔

مغلانی بوا مولوی صاحبان تو یہی کہتے ہیں کچھ نہ ہو خلوص ہو

---

[1] واجد علی شاہ مرحوم

نواب جہاں: مولوی، مولوی بس رہنے دو، ان نوری فرشتوں کے قربان، وقت دیکھی بات کہنا ان کا کام ہے جان عالم یہ کیا سب لکھنؤ والوں پر ہمیشہ اوکھیاں آتے رہے۔ دین میں دنیا ملا دی ہے غیروں کی رسمیں لے لی ہیں۔ جیسے مذہب خرانٹ پیدا ہوا تھا۔ عرب کے بدوؤں ہی کے لیے اترا تھا۔ گنگا جمنا کی سنہری روپہلی دھاروں کی رنگینی سے اس کا کوئی واسطہ نہ تھا

معظمانی بوا: سنتی تو میں بھی ہوں کہ نمک اور جو کی روٹی سے جو روزے کھلتے ہیں وہی مقبول ہوتے ہیں

نواب جہاں: ہاں عرب اور افریقہ والوں کی نماز روزے تو یونہی قبول ہوتے ہوں گے۔ میں کہتی ہوں جب نمازیں بغیر فرش مصلیٰ قبول ہوتی ہیں تو یہ سنگ مرمر کی مسجدیں ان میں بجلی کے پنکھے مخمل کے مصلوں کو مولویوں نے کیوں قبول کیا۔ قرطبہ اور دہلی کی جامع مسجد میں کروڑوں روپیہ کیوں لگائے۔ سنو بیوی اللہ لگتی کہو چاہے دنیا ہو چاہے دین، خرانٹ پن کہیں نہیں چلتا۔

معظمانی بوا: تو بیگم پھر چاہتی کیا ہو۔

نواب جہاں: جیسے روزے رکھتے تھے ویسے ہی روزے اللہ نے رکھوائے تو رکھیں گے۔ اللہ اکبر ہماری روزہ کشائی کس شان سے ہوئی تھی۔ میرا ساتواں برس بھر رہا تھا انگنے[1] سال میں روزہ کیسے رکھوایا جاتا۔ اماں جان خوش بھی بہت تھیں۔ مجھے دیکھ دیکھ کر کڑھتی بھی تھیں۔ ابا جان کہتے تھے کہ یہ گرمیوں کے پہاڑ سے دن میری بچی کیونکر روزہ رکھے گی۔

مگر بہر طور روزہ تو رکھنا ہی تھا۔ جان عالم سے اجازت حاصل کی گئی۔ میں ان کی بہت سے قربان فرمانے لگے نواب، وہ ان پان سی روزے کی گرمی سے کملا جائے گی۔ ابا جان نے عرض کی کہ یہ [illegible] انگنا سال ہے اور نو برس سے روزہ واجب۔

فرمایا اچھا بھئی خدا کے حوالے کیا۔ افطاری ہمارے یہاں سے جائے گی۔ اگرچہ روزہ اپنے ہی [illegible] اچھا معلوم ہوتا ہے۔ مگر خیر خود بھی آؤں گا۔

ابا جان خوش خوش گھر آئے۔ اماں جان سے کہا۔ لو خود جان عالم آئیں گے۔ اماں جان

---

[1] [illegible] سال عورتوں کی شرح میں منحوس سال ہوتا ہے [illegible] تھا۔

بھی خوش ہوگئیں کہنے لگیں آپ گے کیوں نہیں بادشاہ ہونا اور چیز ہے عزیز داری اور چیز ہے
ابا جان فرمانے لگے ، بیگم خدا ان کو سلامت رکھے میری عرض سے پہلے فرما دیا ایسے
بادشاہ تو کہانیوں میں نہیں سُنے ۔

غرض جوڑے باگے بنے اور بٹے۔ گھر کی لیپ پوت ہوئی۔ روشنی کا انتظام ہوا۔ نوبت
چھاپی گئی۔ پوری ایک شادی تھی میں سب کہاں تک بیان کروں گی ۔

اب سُنو کہ ہونٹوں پر دم آگیا مگر روزے کا وقت اب آنا ہی نہ جب ۔ نگوڑی نیند
بھی اڑ گئی تھی اماں جان ابا جان میرے سوکھے ہونٹوں کو دیکھ کر خود سوکھے جا رہے تھے ۔ خس
کی ٹٹیاں چھڑکی جا رہی تھیں ۔ فراشی پنکھے چل رہے تھے مگر گھبر گھبرایا ہوا تھا۔ خدا خدا کر کے
پانچ بجے ۔ ابا جان دوڑے دوڑے آئے مجھے گلے سے لگایا کہا بس اب کیا رہا ہے دو گھنٹہ اندر
ہیں وہ بھی جان عالم کے آنے کی دھوم دھام میں پلک جھپکتے میں کٹ جائیں گے یہ باتیں تھیں
کہ مردہوں ، نقیبوں ، ہرکاروں ، عصا برداروں ، چوب داروں ، خدمت گاروں ، کے
غٹ کے غٹ ، غول کے غول ڈیوڑھی پر جمع ہوگئے ۔ معلوم ہوا کہ سواری مبارک روانہ ہو چکی
ہے ۔ میں اپنے کمرے سے نکل کر صحن میں آئی ہی تھی کہ محل داروں نے چرخی پر پردہ کھینچا اتنے میں خانو
کہاریوں ، باری دارنیوں ، آتووں ، مغلانیوں ، چھوچھو اناؤں ، دائیوں قرینے سے ہوئیں دو رویہ
صفیں باندھیں اور سب مل کر مجرا بجا لائیں ۔ جہاں پناہ جان عالم سلامت کی دھوم ہوئی کہاروں
سے کہاریوں نے بوچہ اپنے کاندھے پر لیا تخت کے چوکے پر مسند گاؤ تکیہ آراستہ تھا ۔ چوکے کے
قریب آ کر کہاریوں نے بسم اللہ الرحمن الرحیم کی آواز دی ۔ بوچہ رکھا گیا ۔ (آنکھوں میں آنسو بھر کر)
میں سچ کہوں جان عالم یوں اُترے جیسے شاخ سے گلاب کا پھول ۔ سیوتی کے عطر سے گھر دوکان
مہک رہا گیا ۔ اب اماں جان ابا جان کی باری تھی دونوں نے دست بستہ مجرا کیا ۔ میں نے ہزاروں
بار جان عالم کو دیکھا تھا اگر یوں کہوں کہ ان کی گود میں کھیلی تھی تو جھوٹ نہ ہوگا مگر میں شرما کر پیچھے
ہٹنے لگی تو جان عالم نے لمبا سا قدم رکھ کر مجھے گود میں اُٹھا لیا اور فرمانے لگے میں بی بی

کے لیے افطاری لے کر آیا ہوں تمھارے ماں باپ نے اتنی جلدی کی کہ کافی انتظام نہ ہو سکا
ابھی وقت ہی دیکھ لو کوئی پکوان یا پھل رہ گیا ہو تو ابھی آ سکتا ہے۔ ہاں یہ لو یہ کہہ کر پانچ تھیلیاں
اشرفیوں کی ایک مرصع ہار مجھے دیا۔ یہ تمھارے سب روزوں کی افطاری ہے۔

میں نے کہا چچا ابا گھر میں بھی تو افطاری بنی ہے۔

اماں جان نے تیوری چڑھا کر مجھے دیکھتے ہوئے کہا لے توبہ ہے لڑکی یہ افطاری بھی
کوئی افطاری ہے۔

جان عالم بیٹی میں تمھارے لیے افطاری لایا ہوں اور یہاں جو تیار ہے وہ میرے لیے ہے آخر میں بھی تو
روزے سے ہوں۔

میں نے کہا چچا ابا کیا بادشاہ بھی روزے رکھتے ہیں۔ جان عالم مسکرائے اور فرمانے لگے کیا بادشاہ
اللہ کے بندے نہیں ہوتے۔

ماما بیوی کیا جان عالم روزے رکھتے تھے ہم تو کچھ اور ہی سنتے ہیں۔

نواب جہاں بگڑ کر درموئی "ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں" جو جان عالم کو عیاش تماشہ بین کہتے
ہیں اللہ کے یہاں جواب دیں گے دنیا میں دیدوں گھٹنوں کے آگے آئے گا۔

ماما اے بیوی ہم تو گلی گلی یہی باتیں سنتے ہیں۔

نواب جہاں درموئی سننے کو کیا ہوا کیا ہمارے کانوں میں۔ خبر نہیں پڑی۔ کہتے کون ہیں وہ جنھوں نے
فرنگیوں سے بنشنیں پائیں، جائدادیں لیں عہدے ملے انگریزوں کو تو ملک دبانا تھا کیا اچھا کھ کر اوڈ
پر قبضہ کر سکتے تھے مغلانی بوا ٹھنڈی سانس لے کر غیر تو غیر اپنوں پر کیا غصہ آتا ہے جیسے موؤں
کے منہ میں لگام ہی نہیں۔

نواب جہاں سچا سوں شریف بھی تھے۔ مولانا عبد الحلیم شرر مرحوم کو دیکھو اُن کے مضمون پڑھو دلگداز کے رسالے
کے رسالے جان عالم کے حالات سے بھرے پڑے ہیں۔ صادق علی صاحب مائل مرحوم مجھکو خوب
یاد ہیں جب جان عالم کا نام آتا تھا اُن کی آنکھوں سے بھل بھل آنسو بہتے تھے مولوی علی صاحب حیدر

مرحوم نظم طباطبائی کہتے تھے ہمارا بادشاہ زندگی میں بھی مظلوم تھا مرنے کے بعد بھی مظلوم ہے۔ یہ سب جان عالم کے مصاحب تھے پاس سے دیکھا تھا اندرونی حالات جانتے تھے۔

مغلانی بوا اے بیگم چھوڑو اُن باتوں کو جن سے دل دکھے ہاں تم تو اپنی کہو۔

نواب جہاں پھر کیا روزے کے افطار میں کوئی دس منٹ باقی تھے کہ چچا ابا نے فرمایا اب کیا انتظار ہے۔ آخر لڑکی کو قرآن مجید کی وہ آیتیں اور روزہ کھولنے کی دعا بھی تو پڑھنا ہے۔ کلام اللہ لاؤ۔

امّی جان کلام اللہ سر پہ لے کر آئیں جان عالم تعظیم کو کھڑے ہو گئے۔ ابا جان نے دوسرا پارہ کھولا اور چچا ابا نے وہ آیتیں پڑھائیں جن میں روزے کے واجب ہونے کا ذکر ہے۔ میں پہلے ہی ترجمہ کے ساتھ کلام اللہ پڑھ چکی تھی اماں جان اور ابا جان نے مجھ پر سے کچھ اشرفیاں صدقے کی اتاریں۔ چچا ابا نے تجدید وضو کی اور مصلّے پر بیٹھ گئے اتنے میں توپ چلی جان عالم نے نماز شروع کی (آنکھوں میں آنسو بھر کر) نمازیں تو بڑے بڑوں کی دیکھیں مگر وہ آواز اب بھی کانوں میں گونجتی ہے نماز کے بعد چچا ابا دسترخوان پر تشریف لائے اتنے میں پھر شور ہوا اور چچی اماں یعنی خاص محل کی سواری آن لگی ان کے ساتھ دو سو ملازم عورتوں سے کم نہ تھیں۔ چچا ابا بولے۔ لو آخر قرار نہ آیا کہا تھا کہ ساتھ چلو تو قرآن شریف پڑھنے کا حیلہ کیا مگر میں جانتا ہوں کہ گلوریاں بن رہی تھیں،

مغلانی بوا بیگم دسترخوان تو بہت بڑا ہوگا۔

نواب جہاں ہاں سنو سب سے پہلے چچا ابا نے دعائے افطار پڑھائی اور نمک کی چھوٹی سی کنکری میرے منھ میں دی جو بچ گئی وہ خود نوش فرمائی ہاتھ اُٹھا کر کچھ دعا کرنے لگے۔ اُن کی پلکیں بھیگی ہوئی تھیں پھر آب دار خانے والیوں کی طرف نظر فرمائی تازہ تازہ فرنگیوں نے بلّور کے گلاس بڑے خوبصورت نذر دیئے تھے اُن میں سے کسی میں شربت انار، کسی میں شربت سنترہ، کسی میں فالسہ کا شربت کسی میں لوزانی فالودہ، کسی میں کیوڑے سے بسا ہوا تخم ریحان دیا گیا میں نے تھوڑا سا فالسہ کا آبشورہ پیا (نوبت بجنے لگی)

دسترخوان کو کیا کہوں اتنی افطاری تو تھی کہ چار پانچ سو آدمی شکم سیر ہو کر کھا لیں اور پھر بچ رہے

ماما "اے بادشاہوں کا کیا جتنا چاہا اٹھا ڈالا۔

نواب جہاں مُدّ ہوئی بڑی دادی اماں (نواب بہو بیگم صاحبہ) کہا کرتی تھیں کہ خدا نے ایک ہی چیز ایسی بنائی ہے کہ کتنی ہی زیادہ ہو رات بھر گھر میں ٹک نہیں سکتی وہ مرحومہ دیگوں کے لیے کھانا کرتی تھیں ہزار دیگ روز پکی۔ صبح کو معلوم ہوا کہ ایک دانہ باقی نہیں ہے۔ یہ لوگ یوں بھی محتاج پروری کرتے

مغلانی بوا اور کھانا اس کے بعد تھا۔

نواب جہاں اور کیا۔ اس کا وقت تو دو دو گھنٹہ کے بعد آیا۔ میں فقط گلوریاں بتاؤں جو چچی اماں خاص محل ہمراہ میرے لیے لائی گئی تھیں اور سب چچی اماں کی بنائی ہوئی تھیں۔

گلوری، بیڑا۔ گوٹ۔ سنگھاڑیا۔ جو گھڑا۔ بند گلوری۔ مچھلی پان۔ اختر پسند۔ خاص لپ چاندی۔ سونے کے چنگیر۔ خاص دان، شالبات کی لچکہ لگی صافیاں، موتیے اور مدن مان کے پھول سے بسے ہوئے خاصدان کھلتے ہی گھر مہک جائے۔ ایک گلوری کھا لو تو منہ سے ہونٹوں تک کا رنگ پھول والی گلی ہو جائے۔

مغلانی بوا تو یہ سب کچھ ہو تو آپ روزے رکھیں گی۔

نواب جہاں (ماتھے پر ہاتھ مار کر) تو پھر کیا جو چپاتے آتے ہیں روزے رکھے جاتے ہیں اے بیوی تم نے بھی غضب کیا تو کیا جو اور چباتے ہوئے آتے۔ ہم لکھنؤ والے ہیں ہم ہم ہی ہیں۔ تم تم ہی

عداوت کی جڑ

ایک انگریز فلسفی سے کسی نے کہا کہ فلاں شخص فلاں مجمع میں آپ کو بُرا کہہ رہا تھا اس نے سر جھکا کر دیر تک غور کیا اور پھر کہنے لگا اس شخص کے بُرا کہنے کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی میں نے تو اس کے ساتھ کوئی احسان نہیں کیا تھا۔

(حضرت مناظم)

ادب اردو میں نئی چیز کا اضافہ

(پروفیسر سید [illegible] صاحب لکھنؤ)

ہر زبان کا قاعدہ ہے کہ تغیر حکومت یا ملکی رسم و رواج کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ بعض الفاظ کا استعمال کسی زمانے میں بکثرت ہو جاتا ہے اور بعض کا بہت کم۔ یہاں اُن الفاظ و ترکیبات کا استیعاباً ذکر مقصود نہیں جو قلیل عرصہ سے کسی خارجی زبان کے اثر سے اُردو میں خلط ملط ہو گیے ہیں بلکہ زیادہ تر ان الفاظ کا ذکر مقصود ہے جو زبان اُردو میں داخلی حیثیت رکھتے ہیں یعنی مشرقی زبانوں کے اختلاط نے انھیں تخلیق کر دیا ہے۔ جیسے عربی۔ فارسی اور بھاشا کے الفاظ۔

غرض یہ ہے کہ بعض الفاظ گو اپنی جگہ مواقع استعمال کے لحاظ سے برقرار تو رہتے ہیں لیکن ان کا محل صرف یا تو بالکل مفقود ہو جاتا ہے یا مراتب استعمال میں کمی آجاتی ہے۔ مثلاً دور سلطنت مغلیہ کے متعدد الفاظ جو وسعت کے ساتھ استعمال ہوتے تھے۔ اور کثرت کے ساتھ قبول کیے جاتے تھے آج صرف لغتوں میں دکھائی دیتے ہیں کیونکہ اُن کا محل صرف مفقود ہو چکا ہے۔ مثلاً فرغل۔ جبہ۔ لبادہ۔ اچکن۔ چپکن اور مندیل جن کے بجائے اُورکوٹ۔ جسٹر۔ واسکٹ۔ شیروانی وغیرہ کا استعمال عوام میں بکثرت پایا جانے (لگا) ماہی مراتب۔ روشن چوکی۔ عصا بردار۔ اور ذیل بردار تو گویا بالکل غائب ہی ہو گیے۔

کثرت و قلت کے ساتھ الفاظ کے استعمال کو جانچنے کا معیار ادبی حیثیت سے صرف نظم و نثر ہی کے ذریعہ سے ممکن ہے لہذا نثاروں اور شعرا کے میلان طبع اور ضرورت وقت کی طرف لامحالہ نظر جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ مولوی عبد الحلیم شرر مرحوم نے جب اُردو میں ناول نویسی کی ابتدا کی تو زیادہ تر انگریزی کے ہم معنی الفاظ اُردو میں استعمال کرنے لگے۔ اور اس کے سوا کوئی چارہ کار بھی نہ تھا۔ ڈراما اور ناول نے خود یورپ میں ایک نیا ادب پیدا کر دیا تھا اگرچہ عربی اور فارسی کے الفاظ معناً ناول کے مصرف میں آسکتے تھے مگر اس سے قبل انھیں اس جدید نثر (ناول) کے ساتھ مسلک عبارت میں منسلک ہونے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ حکیم محمد علی خاں مرحوم نے بے شک ناولوں میں ادب اُردو کے صحیح پہلو کو نظر انداز نہیں کیا۔

اس سے قبل کی اُردو تصانیف جو ناول نویسی کے حدود میں آتی ہیں۔ وہ فسانۂ عجائب فسانۂ آزاد

داستان امیر حمزہ وغیرہ ہیں۔ لیکن آپ کو اُن کا صرف الفاظ اور رنگ عبارت معلوم ہے لہذا طول دینے سے کیا فائدہ۔

رہی نظم کے زیادہ تر معمول بہ الفاظ جو بعض تو خاص تلمیحات کے ساتھ اور دوسرے اس وقت کے رنگ مضامین کے ساتھ مستعمل ہوتے تھے۔ مثلاً گل و بلبل۔ قید و قفس مستی و مدہوشی، طور و ایمن وغیرہ۔ جو اس وقت کی نظم میں شاذ و نادر ہی پائے جاتے ہیں۔

موجودہ دور میں فسانہ نویسی اور ادا کاری کے ضمن میں جو الفاظ آغا حشر کاشمیری مرحوم نے پہلے پہل نثر اً استعمال کیے وہ سب کے سب اس میدان میں مدتوں گھومتے رہے اور انھیں کے زیر اثر ملک کے اکثر موجودہ شعرا (غزل میں)، اسی قماش کے الفاظ صرف کر رہے ہیں مثلاً ہجوم تجلّی اور ہجوم نور وغیرہ (یا) نفتی نظر ترنم معصومیت۔

(۱) جیسے گہوارۂ تبسم میں محبت جھولا جھول رہی ہے۔
(۲) کسی حسین کے نورانی رخسار پر معصومیت اٹکھیلیاں کر رہی ہے۔
نشیلی آنکھوں کی حرکت اُلفت کے پینگ بڑھا رہی ہے۔

اسی طرح اس وقت نظم کہنے والے شعرا کا خالص مطمح نظر یہ ہوتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ فارسی کی مستعمل یا خود ساختہ ترکیبات استعمال کریں۔ حالانکہ ان کے مترادفات موضوعات کی فہرست میں موجود ہیں اور بہ کثرت موجود ہیں مجھے جہاں تک رسائل ادبیہ سے سابقہ پڑا ہے۔ شاید ہی دو ایک نظمیں ایسی ہوں جن میں اُردو کا بحیثیت زبان لحاظ رکھا گیا ہو۔ جس کے چند در چند وجوہ ہیں۔ پھر کبھی اس وقت قارئین کے سامنے مجھے ایک نہایت دلچسپ چیز پیش کرنی ہے اور وہ (چیز) کا گذشتہ اور موجودہ استعمال ہے

گذشتہ استعمال۔

بچوں کے شوق اور خوشی کے سلسلہ میں جب چیز کا استعمال ہوتا تھا تو اس سے کوئی ایسی شے مراد ہوتی تھی جس سے اُن کی قوت ذائقہ کا خاص لگاؤ ہونا لازمی تھا۔ مثلاً مٹھائی اور پھل وغیرہ جب وہ تھوڑے سے بہت ہوشیار ہو جاتے تو اس کے ساتھ عمدہ یا اچھی کا اضافہ ضروری تھا۔ اس وقت

کھانے پینے والی اشیاء سے گذر کے "چیز" کی معنویت کا دائرہ اور وسیع ہو جاتا تھا یعنی ہر دل خوش کرنے والی شے یا پسند آنے والی چیز مقصود ہوا کرتی تھی۔ جیسے ملاعب و ملابس۔

اس مصرف کے بعد "چیز" کا عام استعمال تحریر و تقریر میں مختلف معنوں کے ماتحت تھا فصحائے زبان جس کے اب تک پابند ہیں مثلاً :۔

(۱) ضرورت کی ہر چیز۔

(۲) مفہوم تحفہ و فرمائش کے شمول سے مثلاً۔ آپ ہماری چیز لائے ؟

(۳) استہزاء جیسے۔ آپ بھی عجب چیز ہیں۔

(۴) اظہار استغنا۔ جیسے۔ خودداری بھی کوئی چیز ہے۔ اُس نے پیش کش منظور نہیں کی۔

(۵) بلحاظ اہمیت۔ جیسے اس وقت ڈاکٹر عبدالحق ادب اردو میں ایک چیز ہیں۔

(۶) خصوصیت۔ "کون سی چیز ہے جو اس کتاب میں نہیں پائی جاتی ؟

(۷) نفس و اکراہ۔ جیسے وہ بھی کوئی کھانے کی چیز ہے۔

(۸) غزل مع ترنم۔ محفل میں جیسے ...... نے بڑی عمدہ چیز گائی۔ (مستعمل خواص)

.... فلاں نے غضب کی چیز کہی ۔ (مستعمل عوام)

(۹) سبب۔ وجہ۔ جیسے۔ کس چیز نے تم کو اس سے باز رکھا ؟ وغیرہ۔

گذشتہ محل صرف سے گذر کے اس وقت چیز کا استعمال ذیل میں ملاحظہ ہو۔

(۱) بات کی جگہ۔ جیسے۔ یہ چیز میری سمجھ میں نہیں آئی۔

(۲) منظر۔ " ۔ بالکل یہی چیز تو میں نے مصوری پر بھی دیکھی تھی۔

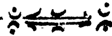
(۳) معاملہ۔ " ۔ یہ تو عدالت کی چیز ہے وہیں سے تصفیہ ہوگا۔

(۴) تحریر۔ " ۔ جو اس میں ہے۔ بالکل وہی چیز اُس اخبار میں بھی ہے۔

(۵) عادت۔ " ۔ تم میں یہ چیز بہت بُری ہے وغیرہ۔

اس وقت ہمارے جدید تعلیم یافتہ نوجوان اوپر بیان کیے ہوئے مقامات کے علاوہ بھی (چنیرا) کو جا و بے جا بے تکلف صرف کر بیٹھتے ہیں۔ انھیں یہ خیال نہیں رہتا کہ اصل زبان کی سلاست اور مناسبت پر اس کا لاابالی صرف کیا اثر پیدا کرتا ہے ایسے الفاظ کے کثرت استعمال کی موافقت میں بعض حضرات کا یہ ارشاد کہ زبان کے دائرے کو تنگ کیوں کیا جائے۔ کوئی معقول استدلال نہیں جب کسی مفہوم کے ادا کرنے کے لیے متعدد الفاظ زبان میں موجود ہیں تو کیا ضرورت ہے کہ کسی ایک لفظ کو مطلق العنانی کے ساتھ ان بے جوڑ مقصد ادا کرنے کے لیے منتخب کر لیا جائے۔

ہماری اُردو زبان کی خوبصورتی اور شیرینی اس پر منحصر ہے کہ جو الفاظ فصحائے گذشتہ و موجودہ جس مقام کے لئے وضع کر گئے ہیں انھیں صرف کرتے وقت صحیح مصرف کا لحاظ رکھا جائے۔ زبان کی لاکھ صورت بدل جائے لیکن اس کی اصلیت ہمیشہ باقی رہنی چاہیے۔



داستان بلاکشاں نہ سنو

عبد فرقت زدہ کا حال نہ پوچھ
نشتر کند تھا ہلال نہ پوچھ

پوچھ کر ہم سے کس نے دی تھی حیات
زندگانی کا اب مآل نہ پوچھ

اپنے ہی آشیاں میں پھنس گئے ہم
کتنے اقسام کے ہیں جال نہ پوچھ

ہجر میں چین ہو تو بات کروں
دل کا حال اے رفیق حال نہ پوچھو

اب نہیں اعتبار اپنا بھی
کس سے کس سے ہوا ملال نہ پوچھ

تھی تو اک چیز جس کو کہتے تھے دل
اب ہمیں خود نہیں خیال نہ پوچھ

کچھ نہ ہونے پر اتنا غرہ ہے
بے کمالی مرا کمال نہ پوچھ

گھر کی عبیدی ہوں نام ہے خوشبو
مجھ سے فردوس گل کا حال نہ پوچھ

نفیس بانو خوشبو بمبئی (مبارک منزل) مرزا علی اصغر

غوث انصاری

بچّہ کا ذہنی ارتقاء

تمام والدین یہ چاہتے ہیں کہ اُن کے بچے بہترین تربیت پائیں اور اعلیٰ تعلیم حاصل کریں۔ مگر بہت کم والدین اس کے لیے عملی طور سے نفسیاتی اصولوں پر بچّہ کی تربیت اور تعلیم کا بندوبست کرتے ہیں۔ بچّہ کی تعلیم و تربیت کے لیے سب سے ضروری چیز بچّہ کے دماغی رجحان کو سمجھنا اور صحیح طور پر اُس کی رہنمائی کرنا ہے۔ بچّہ اپنے مستقبل کے بارے میں طرح طرح کے خیالی پلاؤ پکاتا ہے، ہوائی قلعے تعمیر کرتا ہے اور جھوٹ موٹ اُن پر عمل پیرا ہو کر تھوڑی دیر کے لیے اپنے خوابوں کی تعبیر خود وجود میں لاتا ہے۔ ایسی حالت میں والدین کا فرض ہے کہ وہ بچّہ کی رہنمائی اور ہمت افزائی کریں تاکہ کسی طرح سے بھی، بچّہ کی ہمت پست نہ ہونے پائے۔ کیونکہ بچپن میں وہ جو کچھ سوچتا ہے اور ہوائی قلعے بناتا ہے، اگر اس کی ہمت نہ توڑی گئی اور برابر اس کی پشت پناہی کی گئی تو یقیناً بڑا ہو کر وہ ہوائی قلعے اس کے لیے اصلیت ہو سکتے ہیں

بچّہ کا دماغ بہت تیزی سے ترقی کرتا ہے۔ پیدا ہوتے ہی بچّہ کے نازک دماغ کو جگہ کی تبدیلی کا ہلکا سا احساس ہو جاتا ہے۔ تین مہینے میں دیکھنے، سننے اور بولنے کی طاقتیں حیرت انگیز طور پر ترقی کر لیتی ہیں۔ شروع شروع تو بچّہ کی بصارت اتنی ہوتی ہے کہ جو چیز اُس کے سامنے ہے۔ اُس کی صحیح تصویر کے بجائے اُس کو دھندلے دھندلے دھبّے نظر آتے ہیں۔ قوت سامعہ صرف اس حد تک ہوتی ہے کہ وہ باتوں یا دوسری آوازوں کی ہلکی سی بھنبھناہٹ محسوس کرتا ہے۔ قوت گویائی بالکل نہیں ہوتی۔ اسی طرح سونگھنے اور چکھنے کی حس بھی اُس میں مفقود ہوتی ہے۔ تین مہینے میں یہ پانچوں حواس غیر معمولی طور پر ترقی کر کے کسی حد تک اُس کو حساس بنا دیتے ہیں۔ اس عمر میں بچّہ کو کسی حد تک شکلیں صاف نظر آنے لگتی ہیں۔ آوازوں کا اُتار چڑھاؤ محسوس کرنے لگتا ہے۔ حتیٰ کہ کسی تیز آواز کو سُن کر چونک پڑتا ہے۔ تھوڑا بہت غوں غاں کر لیتا ہے۔ بدبو اور خوشبو میں تھوڑی بہت تمیز کرنے لگتا ہے۔ کسی بدمزہ چیز چکھنے پر مُنھ بنا لیتا ہے۔ دراصل بچّہ کی تربیت کا زمانہ اسی عمر سے شروع ہو جاتا ہے۔

تیسرے مہینے کے بعد ترقی کی یہ رفتار کم ہونے لگتی ہے۔ سمجھنے اور دماغ سے کام لینے کی قوت تیسرے برس پورے طور سے کام شروع کر دیتی ہے۔ ان تین سال میں اس کے حواس خمسہ پورے طور سے اس میں شعور

پیدا کر دیتے ہیں۔ تین برس سے دس برس کی عمر تک بچّہ کا دماغ بہت تیزی سے ترقی کرتا ہے۔ اس عرصہ میں وہ بہت سی دماغی الجھنوں کا شکار بھی ہوتا رہتا ہے اور بہت سی گتھیاں خود بخود سلجھانے بھی لگتا ہے۔ ہر نئی چیز کو دیکھ کر وہ اُس کے بارے میں ہر ہر بات معلوم کرلینے کی کوشش کرتا ہے۔ صحیح معنوں میں یہی شوق بچّہ کو تعلیم پر لگانے، اُس میں استقلال اور مستعدی پیدا کرنے کے لیے انتہائی سود مند ہے۔ ایسے موقعوں پر والدین کو چاہیے کہ وہ بچّہ کے ہر سوال کا جواب حتی الامکان تشفی بخش دیں، اُس کے کسی سوال پر اس کو جھڑکنے یا اُس کے مذاق اڑانے سے قطعی پرہیز کریں۔ کیونکہ جھڑک دینے یا مذاق اُڑانے سے وہ بددل ہو جاتا ہے اور اُس کی ہمّت پست ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے تھوڑے عرصہ کے لیے اُس کی دماغی ترقی کی باڑھ رک جاتی ہے۔ اور اگر یہی باتیں مستقل طور سے بچّہ کے لیئے درپیش آتی رہیں تو وہ کاہل، چڑچڑا اور ضدّی ہو جاتا ہے۔ بچّہ کا دماغ ایک تو یوں ہی بغاوت پسند ہوتا ہے، اور اپنی مرضی کے خلاف ہوتا دیکھ کر تو وہ اور بھی بغاوت پر آمادہ ہو جاتا ہے جس کے نتیجے میں لاشعوری طور پر بچّہ وہ تمام حرکتیں کرنے لگتا ہے جو دوسروں کے لیے تکلیف دہ ہوتی ہیں۔ اگر بچّہ کوئی بات آپ کی مرضی کے خلاف کر رہا ہو تو اُس کو جھڑکنے یا ڈانٹنے کے بجائے دوستانہ لہجے میں اُس کو سمجھا دیجئے۔ اس طرح سے بچّہ بہ آسانی آپ کی مرضی کے مطابق چل سکتا ہے۔ ڈانٹنے یا جھڑکنے سے ممکن ہے کہ آپ کے خوف کی وجہ سے وہ وقتی طور پر باز آ جائے مگر بعد میں جب بھی اُس کو موقع ملے گا وہ پھر وہی حرکت کرے گا اگر بغاوت کے اس مادے نے جڑیں مضبوط کر لیں تو آئندہ چل کر اور بھی مضر حرکات اُس میں پیدا ہو سکتی ہیں۔

تین سے دس برس کی عمر تک بچّہ کے دماغ میں انقلابات پیدا ہوتے ہیں، اس کے رجحان میں تبدیلیاں ہوتی ہیں، وہ بہت سے گھروندے تعمیر کرتا ہے، بہت سے ڈھا دیتا ہے۔ بچّہ کی عمر کے اس حصّہ کے اوائل میں وہ گھر کے ماحول سے قربت کی وجہ سے باہری دنیا سے بے خبر رہتا ہے مگر جیسا جیسا وہ بڑا ہوتا جاتا ہے ویسے ویسے اُس کی دنیا وسیع ہوتی جاتی ہے۔ عمر کے اس حصّہ کے وسط میں پہونچ کر اُس میں جستجو اور عجیب و غریب چیزوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا شوق پیدا ہونے لگتا ہے۔ چھوٹے موٹے کھیل کھیلتا ہے مثلاً کبھی تو وہ ڈاکٹر بنتا ہے۔ اُس کے ساتھی مریض بن کر اُس کے پاس علاج کے واسطے آتے ہیں۔ کبھی وہ لیڈر بن جاتا ہے اور کوشش اس بات کی کرتا ہے کہ اس کے ساتھی اُس کو سچ مچ کا لیڈر ماننے لگیں۔ یا کبھی وہ اخبار کا ایڈیٹر بنتا ہے تو کبھی تاجر

کبھی گھر کا بزرگ بنتا ہے تو کبھی سینما ایکٹر۔ غرض کہ وہ کبھی ایک زندگی پسند کرتا ہے تو کبھی دوسری۔ مگر آگے چل کر اُس کے یہ شوق اُس کی آیندہ زندگی کے لیے مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ جس زندگی کو وہ زیادہ پسند کرتا ہے تو اُس کی طرف وہ زیادہ توجہ دیتا ہے۔ آخر کار جوان ہونے تک وہ ضرور اپنی مراد کو پہنچ جاتا ہے۔ والدین کو چاہیے کہ وہ شروع ہی سے پیشہ کے انتخاب کے سلسلہ میں بچہ کی صحیح رہنمائی کریں۔

دس سے بارہ (۱۲) برس تک کی عمر بچہ کے لیے انتہائی اہم ہے۔ کیونکہ اسی عمر میں بچہ کے کردار کی بنیادیں مضبوط ہونے لگتی ہیں۔ تقریباً بارہ برس کی عمر سے لڑکے اور دس برس کی عمر سے لڑکیاں سن بلوغ کو پہونچ جاتی ہیں اور اُن میں جسمانی تغیرات ہونے لگتے ہیں۔ اس عمر میں لڑکا اور لڑکی شرمیلے، تنہا پسند اور خاموش ہوکر رہ جاتے ہیں۔ لوگوں کے سامنے کم جاتے ہیں، لوگوں میں بیٹھ کر بہت کم گفتگو کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ اُن کو خود اپنے وجود سے بھی حجاب محسوس ہونے لگتا ہے۔ یہ تنہا پسند لڑکے اور لڑکیاں تنہائی میں مختلف قسم کے خیالی پلاؤ پکاتے ہیں اور ہوائی قلعے بناتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ وہ سہانے خوابوں میں محو رہتے ہیں۔ اس عمر میں ذرا سی لغزش اُن کے قدم کو ڈگمگا دیتی ہے اگر اس عمر میں وہ ذرا سا بھی ڈگمگا گئے تو بعد میں سنبھلنا مشکل ہو جاتا ہے۔

چودہ (۱۴) برس کے بعد سے لڑکے کا اور بارہ (۱۲) برس کے بعد سے لڑکی کا یہ دور ختم ہونے لگتا ہے۔ دونوں میں سنجیدگی آنے لگتی ہے سولہ برس کی عمر تک وہ خاصے سنجیدہ ہوکر اپنی آیندہ زندگی کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔

جوان ہوکر انسان میں دو طاقتیں کام کرتی ہیں، ایک تو وہ جن کی بنیادیں بچپن ہی میں مستحکم ہوگئی ہوں، دوسری وہ جو بچپن کی زندگی کا ردِ عمل ہوں۔ اور غیر شعوری طور سے محرکات کا باعث بنیں۔ اس لیے اگر بچپن ہی میں اس بات کا خیال رکھا گیا کہ جن بنیادوں پر آیندہ زندگی کا دارو مدار رہے وہ پائدار اور سود مند ہوں اور وہ عمل جن کا ردِ عمل بچپن کے بعد ہوگا کارگر ہو تو بچہ کی آیندہ زندگی انتہائی کامیاب ہو سکتی ہے ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ والدین اور استاد اُس کی مدد کریں اور اس کے کردار کے ارتقا کے سلسلہ میں نفسیاتی اصولوں کو مدِ نظر رکھیں۔

رباعیاں

تاثرات آہ

ڈاکٹر صفدر صاحب آہ سیتاپوری — ڈاکٹر صاحب قلمی دنیا میں آفتاب کی طرح تعارف عام رکھتے ہیں آپ کی اسٹوریاں اور گانے دور دور مشہور ہیں - یہ نوجوانی میں تہذیب لکھنؤ کے مکمل نمونہ ہیں

(سب اڈیٹر)

دھیمی دھیمی فلک سے مدہوش پھوہار رم جھم رم جھم عروس باراں کا ستار
چھوٹے چھوٹے حباب مٹتے بنتے تھالوں میں تڑپتی ہوئی لہروں کی قطار

(۲)

یہ اونچے جبل اور یہ پستی میری مبہوت کھڑی ہے خود پرستی میری
کونین کے ان وسیع میدانوں میں جیسے رینگ رہی ہے ہستی میری

(۳)

یہ سیل زمانہ کا تلاطم توبہ یہ لیل و نہار کا تصادم توبہ
اس محشر زندگی کے ہنگاموں میں انسان ترے لب کا تبسم توبہ

(۴)

بگڑا ہوا انساں ہے سنورنے والا تہذیب کا حسن ہے نکھرنے والا
اس آج کی پستی سے نہ بد دل ہونا اک کوہ عروج ہے ابھرنے والا

(۵)

رقصاں ہمہ وقت سر پہ تلواریں ہیں شفاف ہیں پھل اُبلی ہوئی دھاریں ہیں
کیا نام اسی کا زندگی ہے یارب ہر سانس میں اژدروں کی پھنکاریں ہیں

(۶)

آتش ہے چھپی ہوئی تہ دود سمجھ کچھ دل کو بشر کے میرے معبود سمجھ
انسان کو مجبور بنانے والے مجبور کا مقدور بھی محدود سمجھ

چٹکلہ

اندھیرے منہ موتی کے ہودج میں ایک سواری اُتری ، عرش کی شفافیت ، قوس قزح کی رنگینیاں ، پریوں کا پردہ ، فرشتوں کی عریانی ، زحل کی نلاہٹ ، مشتری کی صباحت ، عطارد کا لباس ، مریخ کی نگاہ بچاکر آفتاب کی تابندگی چراتی ہوئی ، زہرا کے رباب سے جلترنگ کا نغمہ لے کر چاند کی پشت پر اُتری اور ستارۂ صبح کے سامنے آکر اٹھلائی ، لجائی ، مسکرائی ، پھر بھاگ کر گنجان سبزہ زاروں پُر بہار گلزاروں میں چھپ گئی -

ستارہ صبح کی آنکھ ڈبڈباگئی ، وہ تھرتھرانے لگا وہ شاید خون رویا ، کیونکہ اس سے پہلے شفق نہ تھی ، وہ گرا ہی چاہتا تھا کہ آفتاب کی کرنوں نے اپنا سر اونچا کرکے روکا اور ڈھونڈھ لانے کا وعدہ کرکے دن بھر کے لیے سو رہنے کی تاکید کردی -

سورج کی کرن نے ڈھونڈھنا شروع کیا ، دریا کنارے کے چھوٹے سنگریزوں میں کرن کا رنگ اُن میں جذب ہوگیا ، پہاڑوں کے بڑے پتھروں کے شگافوں میں وہاں کرن کی نوک ٹوٹ کر یاقوت بنگئی دریاؤں کی چرسیں پڑی چادر اُلٹ کر ڈھونڈھا ، حباب کے چہرے کی نقاب اُٹھاکر جستجو کی مچھلی کی لال آنکھوں میں نہ ملی ، صدف کی گھر گرہستی میں نہ نکلی ، ہوا نے کہا مستانی دیوانی ہے ۔ باغوں میں ہوگی ، کرن آہستہ آہستہ آئی ، اوس نے دیکھا باغ سراپا حیرت وعجب ہے ، کسی کو سولی دی جارہی ہے ، کرن جلدی جلدی چلی مگر اس وقت پہونچی جب گناہ گار زمین سے محبت کی سزا میں گلاب کا کانٹا شبنم پری کو سولی دے چکا تھا ۔ محبت میں یہی ہوتا ہے

دیکھو کنواریوں محبت نہ کرنا

(زبیدہ ساجد علیگ)

رباعی

لال آنکھیں میں منھ زرد ہوئے روتے — چونکا دیا اک خواب نے سوتے سوتے
پھر مجھ کے عمر نے لی پہلی کروٹ — پھر ہوگئی شام صبح ہوتے ہوتے

"شا"

دل کی لہریں

حکیم آشفتہ پروفیسر نظامیہ طبیہ کالج (دکن)

چھوڑا نہ ذوق درد نے رسوا کیے بغیر | ہم جی سکے نہ تیری تمنا کیے بغیر
دل کی لگی سمجھا نہ سکی دل کی بیخودی | اک اک قدم پہ خون تمنا کیے بغیر
انداز کہہ رہے ہیں مرے درد دل کے آج | اُٹھنا پڑے گا آپ کو اچھا کیے بغیر
اب تک تو جی رہا ہوں مگر زندگی یہ کیا | تم سے جفائے ناز کا شکوا کیے بغیر
تیرا ہی سب قصور ہے اے نامراد دل | کیوں اُن پہ مر مٹا انھیں اپنا کیے بغیر
چھوڑی نہ دل میں سوز محبت نے کوئی بوند | مشکل ہے اب تو جان کا سودا کیے بغیر

تشنہ رہے گا عشق و محبت کا فلسفہ
دنیائے دل کو درد کی دنیا کیے بغیر

رنگا سیار ایک سیار نیل کے حوض میں اتفاق سے گر کر رنگ گیا جدھر جاتا تھا دوسرے سیار دیکھ کر غراتے تھے اس نے تدبیر سوچی ایک ردّی کاغذ منہ میں دبایا راستے میں تلوار کا نیام ایک ٹوٹی ہوئی ڈاب میں بندھا ہوا نظر آیا لوٹ پوٹ کر کمر سے الجھا لیا اور قوم والوں میں پہونچا سیار غرانے لگے رنگے سیار نے تیور بدل کر کہا کہ بس اب بیہودہ تمیزی برداشت نہ کی جائے گی دیکھو تلوار اور ڈاب دیکھو اور یہ پروانہ پڑھو میں جنگل کا جمعدار کر دیا گیا ہوں دوسرے سیار ڈر گئے اور جمعدار صاحب کی خاطر ہونے لگی چند شکاری کتے دوڑتے پہنچے سب سیار بھاگ کر بھٹ میں گھس گئے جمعدار صاحب آدھے بھٹ میں داخل ہوئے آدھے باہر رہے کیونکہ تلوار کا نیام پھنس گیا تھا اور کتوں نے پہنچ کر رنگے سیار کے کولے پر دانت مارا جمعدار صاحب بولے تیں تیں جو سیار بھٹ میں آچکے تھے انھوں نے کہا جمعدار صاحب اندر کیا جاؤ وہ بولا جمعدار صاحب آئیں کیونکر جمعداری جو اڑی ہوئی ہے سیاروں نے کہا تو پھر ان کو جمعداری کا پروانہ ہی دکھاؤ رنگے سیار نے کہا یہی تو مشکل ہے جاہلوں سے سابقہ پڑا ہے ان میں پڑھا لکھا کون ہے (م۔ عاشق لکھنوی)

مجاز

عبدالقوی ضیا بی اے آنرز
ایم اے علیگ

ناقد مجاز کے کلام میں مجاز کو خود ڈھونڈھ رہا ہے وہ ایسا راہبر ہے جو آستان دوست پر آنکھیں جمائے گزر رہا ہے گلیوں کی ٹھوکروں کی طرف اس کی توجہ ہی نہیں اس لیے قابل نظر نکات مرفوع القلم ہو گئے ——————— (ادارہ)

عشق ہی عشق ہے دنیا میری　　　فتنۂ عقل سے بیزار ہوں میں
اک لپکتا ہوا شعلہ ہوں میں　　　اک چلتی ہوئی تلوار ہوں میں

ممکن ہے جن لوگوں نے مجاز کو قریب سے نہ دیکھا ہو۔ اس کے دل کی گہرائیوں میں نہ غوطہ زن ہوئے ہوں اس کی فطرت کو نہ ٹٹولا ہو وہ اس تضاد کو یک جا دیکھ کر محض سخن گسترانہ بات ۔ یا تعلی سمجھیں مگر جن لوگوں نے مجاز کو دیکھا ہے سمجھا ہے۔ پرکھا ہے۔ اس کے سینہ میں کسی دھڑکتی ہوئی چیز کو ٹٹولا ہے وہ اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ مجاز رومان اور انقلاب کا مرکب ہے۔ اس کی سرشت میں یہ دونوں چیزیں بری طرح سموئی ہوئی ہیں۔ بری طرح جذب ہیں۔ پھر بھی اس کا مطمح نظر محض رومان نہیں ہے۔ اس کی زندگی ان حدود میں آ کر ختم نہیں ہو جاتی۔ وہ یہیں آ کر نہیں رک جاتا ہے۔ بلکہ وہ جانتا ہے کہ یہ دلفریبیاں۔ دلچسپیاں رعنائیاں رومان پسندی۔ لاابالی پن۔ آشفتہ مزاجی۔ زیادہ دیرپا نہیں۔ زیادہ پائیدار نہیں۔ آغاز تو ہے انجام نہیں۔ جادہ تو ہے منزل نہیں۔ اسی لیے وہ جب چاہتا ہے ان راہوں سے کترا کر اصل مقصد کی طرف آ نکلتا ہے۔

میکدہ چھوڑ کے میں تیری طرف آیا ہوں　　　سرفروشوں کی میں باندھے ہوئے صف آیا ہوں
لاکھ ہوں میکش و آوارہ و آشفتہ مزاج　　　کم سے کم آج تو شمشیر بکف آیا ہوں

یہ ہے دراصل اس کی سرشت۔ اس کی فطرت۔ اس کی طبیعت۔ وہ انقلاب کے کھوکھلے گیت نہیں گاتا۔ وہ سرمایہ داری پر دکھاوے کی غرض سے طعنہ زن نہیں ہوتا۔ وہ غریبوں۔ بیکسوں اور

مزدوروں کا حامی صرف فیشن پرستی یا زمانہ کے چلن کی وجہ سے نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کے سینہ میں دھڑکتا ہوا نرم دل۔ دل میں معصومیت سے لبریز جذبات۔ اس کے سر میں زمانہ کی نزاکتوں کو سمجھنے کے لیے ایک حساس دماغ۔ اور اس کی نظروں میں ایک گہری چمک ہے جن میں وسعت نظر کے چشمے لہریں مار رہے ہیں۔

مجاز کے اس غیر معمولی امتزاج۔ اس تضاد کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے دونوں رخوں کو واضح طور پر سمجھا جائے۔ وہ ایک لاابالی۔ رند صفت۔ رومان پسند انسان۔ شراب کا عاشق۔ عورت کے حسن کا پجاری۔ محبت کا دلدادہ ہے یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی نظم میں بہ بانگ دہل کہتا ہے۔

بتاؤں کیا تجھے اے ہم نشیں کس سے محبت ہے
میں جس دنیا میں رہتا ہوں وہ اس دنیا کی عورت ہے
سراپا رنگ و بو ہے۔ پیکر حسن و لطافت ہے
بہشت گوش ہوتی ہیں گہر افشانیاں اس کی

وہ میرے آسماں پر اختر صبح قیامت ہے
ثریا بخت ہے، زہرہ جبیں ہے، ماہ طلعت ہے
مرا ایماں ہے، میری زندگی ہے، میری جنت ہے
مری آنکھوں کو خیرہ کر گئیں تابانیاں اس کی

وہ یہ جانتا ہے کہ گناہ کا لطف۔ گناہ کی لذت، اس کی پوشیدگی۔ اس کے چھپانے میں نہیں بلکہ رسمی پابندیوں۔ مروجہ قیود سے بے باک ہو کر علی الاعلان کرنے میں ہے۔

میں کہ مے خانۂ اُلفت کا پُرانا مے خوار
محفل حُسن کا اک مطرب شیریں گفتار
ماہ پاروں کا ہدف، زہرہ جبینوں کا شکار
نغمہ پیرا و نوا سنج و غزل خواں ہوں میں

آج بھی زندگی مری غرق شراب تند و تیز — آج بھی ہاتھ میں مرے جام شراب ارغواں

آج بھی نکتہ چین ہوں میں خلوتیانِ خاص کا   خلوتیانِ خاص کا آج بھی ہوں مزاج داں
آج بھی اشک خوں مرا قشقہ جبین ناز کا   آج بھی خاک دل مری سرمۂ چشم گلرخاں

....

وہ حقیقت پر پردہ ڈھانکنے کو بزدلی سمجھتا ہے اور اپنی عادتوں کو آشکارا کرنے سے گریز نہیں کرتا ہے
وہ اپنی فطرت کو بے نقاب کرنے میں ذرا سا بھی تامل نہیں کرتا۔

خاک میں آہ ملائی ہے جوانی میں نے   شعلہ زاروں میں جلائی ہے جوانی میں نے
شہر خوباں میں گنوائی ہے جوانی میں نے   خوابگاہوں میں لٹائی ہے جوانی میں نے

حسن نے سامنے وہ لعل و گہر ڈال دیئے
میرے پیمان محبت نے سپر ڈال دیئے

یا ایک دوسری نظم میں کہتا ہے۔

الہ آباد میں ہر سو ہیں چرچے   کہ "دلی کا شرابی آگیا ہے
گلابی لاؤ، چھلکاؤ، لنڈھاؤ   کہ سُشیدائے گلابی آگیا ہے
بتانِ ناز فرما سے یہ کہدو   کہ اک ترک تہابی آگیا ہے

مگر اس کے باوجود نہ اس کے سرشت میں آوارگی ہے۔ نہ بوالہوسی۔ وہ محبت چاہتا ہے۔ محبت کرنا چاہتا
ہے۔ لیکن محبت کے نام پر دھبہ لگانا اس کا شیوہ نہیں وہ عورت کو تقدیس و پاکیزہ نظروں سے دیکھتا ہے
اس کی عصمت کو گراں بہا شے سمجھتا ہے اور اس کو ملکوتی درجہ دیتا ہے۔

تری نیچی نظر خود تیری عصمت کی محافظ ہے   تو اس نشتر کی تیزی آزما لیتی تو اچھا تھا
ترے زیر نگیں گھر ہو۔ محل ہو قصر ہو کچھ ہو   میں یہ کہتا ہوں تو ارض و سما لیتی تو اچھا تھا

وہ اگر کسی کی قسم کھاتا ہے تو وہ بھی ہستیاں ہوتی ہیں۔

قسم شوخی عشق سنجو گتا کی
قسم جوگن کے عزم صبر آزما کی
قسم طاہرہ کی قسم خالدہ کی

مجازِ عشق کے مختلف درجات سے بھی واقف ہے۔ وہ اس کی نزاکتوں سے بھی آگاہ ہے وہ جس سے محبت کرتا ہے اس کو معراج پر پہونچانا بھی جانتا ہے۔ وہ اس چاشنی، اس درد، اس کسک سے صحیح طور پر آگاہ ہے۔ وہ ان منزلوں میں ان راہوں میں خودداری کو بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ کبھی کبھی اس کی شانِ خودداری کسی کو ٹھکرا بھی دیا کرتی ہے۔

اب مرے پاس تم آئی ہو تو کیا آئی ہو
میں نے مانا کہ تم اک پیکرِ رعنائی ہو
چمنِ دہر میں روحِ چمن آرائی ہو
طلعتِ مہر ہو فردوس کی برنائی ہو
بنتِ مہتاب ہو گردوں سے اتر آئی ہو

مجھ سے ملنے میں اب اندیشۂ رسوائی ہے
میں نے خود اپنے کیے کی یہ سزا پائی ہے

اور وہ ان حسینوں سے، مہ جبینوں سے، مہ پاروں سے جب چاہتا ہے کنارا کر لیتا ہے۔

یہ جا کر کوئی بزمِ خوباں میں کہہ دو
کہ اب درخورِ بزمِ خوباں نہیں میں
مبارک تمھیں قصر و ایواں تمھارے
وہ دلدادۂ قصر و ایواں نہیں میں
جوانی بھی سرکش، محبت بھی سرکش
وہ زندانیٔ زلفِ پیچاں نہیں میں

....

وہ اپنے دل میں اتنی سکت نہیں پاتا ہے کہ خود بردیوں کا تختۂ مشق بنے،

دلِ صد پارۂ حوادث کو
تختۂ مشقِ گلرخاں نہ بنا

اس کے نزدیک ان تمام چیزوں کی اہمیت بہت ہی معمولی، بہت ہی سرسری اور تقریباً ناقابلِ توجہ حد تک ہے۔ وہ دوسروں کو بھی تلقین کرتا ہے، خود بھی اثر پذیر ہونا چاہتا ہے۔

بات تو جب ہے کہ مرجاؤ معرکہ گاہِ رزم میں
اس پہ دم دینے سے کیا اور اس پہ دم دینے سے کیا

زمانہ کی شورشیں ان کو نہ معلوم کن کن چیزوں سے بیگانہ بنا دیتی ہیں۔

کچھ تجھکو خبر ہے ہم کیا کیا اے گردشِ دوراں بھول گئے
وہ زلفِ پریشاں بھول گئے وہ دیدۂ گریاں بھول گئے

مجازؔ نے زندگی کو بہت ہی قریب سے دیکھنا چاہا۔ سمجھنا چاہا اور نظریے اخذ کرنا چاہے وہ عشرت گاہوں میں پلے ہوئے نوجوانوں کو ابھارتا ہے اُن کی مردہ رگوں میں جیتا جیتا خون بھر دینا چاہتا ہے ان کی مست زندگی میں تیز روی پیدا کر دینا چاہتا ہے۔ ان میں جذبہ محبت بھی ہے اور غیرت کا مادہ کوٹ کوٹ کے بھر دینا چاہتا ہے۔

اے جوانانِ وطن روح جواں ہے تو اٹھو آنکھ اس محشرِ نو کی نگراں ہے تو اٹھو
خوف بے حرمتیِ فکر و زباں ہے تو اٹھو پاسِ ناموسِ نگارانِ جہاں ہے تو اٹھو
اٹھو نقارۂ افلاک بجا دو اٹھ کر
ایک سوتے ہوئے عالم کو جگا دو اٹھ کر

رنگِ گل ہائے گلستانِ وطن تم سے ہے شورشِ نعرۂ زندانِ وطن تم سے ہے
نشۂ نرگسِ خوبانِ وطن تم سے ہے عفتِ ماہ جبینانِ وطن تم سے ہے
تم ہو غیرت کے امیں، تم ہو شرافت کے امیں
اور یہ خطرے میں ہیں احساس تمھیں ہے کہ نہیں

وہ نوجوانوں کے مضمحل قویٰ میں گرماہٹ پیدا کر دینا چاہتا ہے وہ سوئی ہوئی روحوں میں زندگی کا صور پھونک دینا چاہتا ہے۔ اُن میں آگ کی حیات، شعلوں کی تپش اور بجلی کی تڑپ پیدا کر دینا چاہتا ہے۔

جلالِ آتش و برق و سحاب پیدا کر اجل بھی کانپ اٹھے وہ شباب پیدا کر
ترے خرام میں ہے زلزلوں کا راز نہاں ہر ایک گام پہ اک انقلاب پیدا کر
تو انقلاب کی آمد کا انتظار نہ کر جو ہو سکے تو ابھی انقلاب پیدا کر

پھر بھی اس کی گرماہٹ میں ایک نرمی۔ اس کی حدت میں ایک خنکی اور اس کی تڑپ میں ایک ہلکا سا سرور ہے۔ بقول فیض احمد فیضؔ۔ اس کے انقلابی نغموں میں بھی برسات کے دن کی سی سکون بخش خنکی ہے۔ اور بہار کی رات سی گرم جوشی کی تاثر آفرینی ہے۔" اس کی نظریں دور لیکن بہت دور

کسی آنے والے انقلاب کی پیشین گوئی کرتی ہیں۔ وہ بادلوں کی اوٹ میں چھپے ہوئے ستھرے آسما کو دیکھ لیتا ہے وہ سیاہی سے ڈھکے ہوئے کسی روشن دن کی آمد کا اندازہ کر لیتا ہے وہ گھپ اندھیرے میں کسی تابناک چمک کا احساس کر لیتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ نہ یہ نظام زیادہ پائدار ہے نہ اس کے اصول نہ اس کے اس ماننے والے اور پھر ایک دن کیا ہوگا۔

کوہساروں کی طرف سے سرخ آندھی آئے گی — جا بجا آبادیوں میں آگ سی لگ جائے گی
ختم ہو جائے گا یہ سرمایہ داری کا نظام — رنگ لانے کو ہے مزدوروں کا جوش انتقام
حشر در آغوش ہو جائے گی دنیا کی فضا — دوڑتا ہوگا ہر اک جانب فرشتہ موت کا

اور آخر کار

اور اسی رنگ شفق میں با ہزاراں آب و تاب — جگمگائے گا وطن کی حریت کا آفتاب

انسانیت کن کن ترچھی ٹیڑھی راہوں سے ہو کر گزری، کن کن حدوں میں داخل ہوئی۔ کن کن منزلوں میں پناہ گزیں ہوئی۔ اس کی دور بیں نظریں اس کا بخوبی تجزیہ کر لیتی ہیں اور جلدی ہی اک conclusion پر پہنچ جاتی ہیں۔

آدمی منت کش ارباب عرفاں ہی رہا — درد انسانی مگر محروم درماں ہی رہا
اک نہ اک در پر جبین شوق گھستی ہی رہی — آدمیت ظلم کی چکی میں پستی ہی رہی

....

یہ مجازؔ ہی کی وسعت خیالی ہے یہ اسی کی بلند نظری ہے کہ وہ برائیوں میں بھی اچھائی کے پہلو دیکھ لیتا ہے تاریکی میں بھی روشنی کی جھلک محسوس کر لیتا ہے۔ تخریب میں بھی تعمیر کے محل تیار کر لیتا ہے۔

تقدیر کچھ ہو کاوش تدبیر بھی تو ہے
تخریب کے لباس میں تعمیر بھی تو ہے
ظلمات کے حجاب میں تنویر بھی تو ہے
آ منتظر ہے عشرت فردا

یہی چیز اس کی غمازی کرتی ہے کہ مجازؔ کے یہاں Pessimism نام کو نہیں ہے۔ رجائیت چھو کر نہیں گزری۔ اور وہ زمانے کے مصائب۔ تکالیف اور مشکلات کا مقابلہ کرنے کو محض کسی آنے والے خوش آیند خواب کی امید میں تیار رہتا ہے۔

وہ زمانہ جب ادب محض ذہنی عیاشی۔ دماغی خط اور تفریح کا ذریعہ تھا۔ کہیں دور جا چکا ہے اب ہم ادب میں زمانے کے روزمرہ واقعات کا عکس پاتے ہیں۔ دکھ درد کے نقوش دیکھتے ہیں اور ادب کو زندگی کے اتنا ہی قریب پاتے ہیں جتنا گردن سے شہ رگ۔ اب ہمارے ادب میں زندگی ہے۔ حیات ہے روح ہے اب وہ حقائق کی ان مضبوط بنیادوں پر اپنے قدم جمائے ہوئے ہے جو نہ منہدم ہونے والی ہیں۔ مجازؔ کا حساس دل ناممکن تھا کہ ان چیزوں کو محسوس نہ کرتا اور وہ اُمنڈتے ہوئے انقلاب سے بغیر متاثر ہوئے کترا کر نکل جاتا ہے وہ بھی وقت اور زمانے کے ساتھ ساتھ ہے ان کا ہم نوا ہے۔ ان کا دمساز۔ اس کی نظموں میں بھی ترقی پسندیت کے عناصر ہیں۔ اس کے یہاں بھی یہ اجزا ہیں۔ اس کی نظموں میں بھی رجعت پسندی پر طعنے ہیں۔

زمانے کے نظام زنگ آلودہ سے شکوہ ہے قوانین کہن آئین فرسودہ سے شکوہ ہے

اس کی نظموں میں بھی زندگی کے تڑپتے ہوئے جلوے ہیں۔ اس کے یہاں بھی حیات انسانی کے تذکرے میں حقیقتوں کے صحیح نقشے ہیں وہ "آوارہ" میں ایک اپنے ہی جیسے انسان کے ذہنی کشمکش کا خاکہ کھینچتا ہے

شہر کی رات اور میں ناشاد و ناکارہ پھروں
جگمگاتی جاگتی سڑکوں پہ آوارہ پھروں
غیر کی بستی ہے کب تک در بدر مارا پھروں
اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

رات ہنس ہنس کر یہ کہتی ہے کہ میخانے میں چل
پھر کسی شہناز لالہ رخ کے کاشانے میں چل
یہ نہیں ممکن تو پھر اے دوست ویرانے میں چل
اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

ترقی پسندیت کے عناصر اس کے تخئیل کا جزو بن کر رہ گئے ہیں ۔

اک محل کی آڑ سے نکلا وہ پیلا آفتاب
جیسے مُلّا کا عمامہ جیسے بنیئے کی کتاب
جیسے مفلس کی جوانی جیسے بیوہ کا شباب

اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

اور پھر کبھی کبھی وہ زمانے کے مصائب کشمکش اور الجھنوں سے گھبرا بھی اٹھتا ہے اور اس جاگیردارانہ نظام اور سرمایہ دارانہ ذہنیت کے پرخچے پرخچے اڑا دینا چاہتا ہے اور جذبات اس کے اوپر بری طرح سے حاوی ہو جاتے ہیں ۔

لے کے اک چنگیز کے ہاتھوں سے خنجر توڑ دوں!
تاج پر اس کے دمکتا ہے جو پتھر توڑ دوں
کوئی آئے یا نہ آئے میں ہی بڑھ کر توڑ دوں

اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

بڑھ کے اس اندر سبھا کا ساز و ساماں پھونک دوں
اس کا گلشن پھونک دوں اس کا شبستاں پھونک دوں
تختِ سلطاں کیا میں سارا قصرِ سلطاں پھونک دوں

اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

لیکن مجاز کی شاعرانہ قوتوں اور صلاحیتوں کے متعلق کہیں پر کوئی صحیح اندازہ لگا لینا، کوئی حد مقرر کر دینا یا نظریہ قائم کر لینا زیادہ مناسب ہوگا اس کی شاعری ابھی جگہ پہونچ کر کسی خاص نقطہ پر ٹھہر نہیں جاتی بلکہ ابھی اس میں آگے بڑھنے، پھیلنے اور ترقی کرنے کی بے انتہا قوتیں پنہاں ہیں اور بقول فیض اس کے یہاں جذبات کی سطحیت اور محدود خیالی نہیں ہے۔ ابھی اس میں ارتقا کی گنجائش اور پھیلنے کا امکان ہے اس کے شباب میں بڑھاپے کا رنگ نہیں جھلکتا۔ اس کے شعر میں تھکن نہیں مستی ہے، اداسی نہیں سرخوشی ہے"

اللہ کرے زورِ شباب اور زیادہ

خمار بارہ بنکوی —— "بادۂ سخن"

اندھیری رات تھی، گو چاند بھی تھا اور تارے بھی — مری آنکھوں نے دیکھے ہیں خمار ایسے نظارے بھی
کوئی عیش و مسرت کے طلبگاروں سے کہہ دیتا — کہ گزرے تھے انہیں راہوں سے پہلے غم کے مارے بھی
محبت سے الگ رہنا ہی اچھا حضرت ناصح — مگر اکثر سفینے ڈوب جاتے ہیں کنارے بھی
دل و جاں تجھ پہ صدقے میرے آنسو پونچھنے والے — مگر آنکھوں کو پھونکے دے رہے ہیں کچھ شرارے بھی
محبت کرنے والوں کی سمجھ میں کاش آ جاتا — کہ دل کے ٹوٹتے ہی ٹوٹ جاتے ہیں سہارے بھی

خمار اب یہ زمانہ شوق سے ہم پر ہنسے لیکن
محبت کو خدا بخشے کبھی تھے دن ہمارے بھی

شکستِ یقین

کہا یہ دوست سے میں نے کہ تو اداس ہے کیوں — کلام تک نہیں مربوط بد حواس ہے کیوں
ہوئے ہیں کیوں سر گردن خمیدگی کے سپرد — تھی جن نگاہوں میں امید ان میں یاس ہے کیوں
شباب شعلۂ شمع ہوا رسیدہ ہے کیوں — یہ تھرتھری سی لب خنداں کے آس پاس ہے کیوں
پس تبسم مصنوع شان گریہ ہے — ذرا بتا غم و شادی میں التباس ہے کیوں
پھٹا پڑا ہے یہ کس کا لفافۂ رنگیں — شراب کیا ہوئی ٹوٹا ہوا گلاس ہے کیوں
دعائیں ہو چکیں ناکام تو دعا کیجیے — ہے کارساز امید بشر ہراس ہے کیوں
کہا یہ دوست نے یہ راز سب سے پنہاں تھا — نہ تجھ سے چھپ سکا اتنا ادا شناس ہے کیوں
بشر بشر کا ہے ہمدرد اگرچہ ہے مشہور — کسی نے ہم سے نہ پوچھا کبھی اداس ہے کیوں

نہ آسماں نہ کسی مہ جبیں نے مارا ہے
ہمیں ہمارے شکست یقیں نے مارا ہے

(حمیدہ ساجد علیگ)

تبرّکات

لکھنؤ میں ہزاروں ایسی باکمال ہستیاں گزری ہیں جن کا کمال بھی اُن کے ساتھ دفن ہوگیا اور قبروں کا بھی پتہ نہ رہا۔ ادارہ ہمراہی نے اپنے فرائض میں اس فریضہ کو نمایاں جگہ دینا تجویز کیا ہے کہ آپ کے سامنے ان باکمال ہستیوں کے متعلق کد و کاوش کے بعد تحقیقی مقالات پیش کرے۔ سید محمد حنیف صاحب اُمید لکھنؤ کے مشہور و معروف خاندان اجتہاد کے ایک نمایاں فرد تھے اُن کے صاحبزادے مولوی سید محمد کاظم صاحب جاوید مرحوم آخری دور کے اساتذہ میں تھے آج یہ چند شعر اُن کے قلمی دیوان سے پیش کیے جاتے ہیں ——— (ادارہ)

یاد اشکوں سے ہم آدابِ سفر رکھتے ہیں — راہ میں تیری عوض پاؤں کے سر رکھتے ہیں
باخبر کس کے نقائص کی خبر رکھتے ہیں — وہ نظر ہی نہیں کرتے جو نظر رکھتے ہیں
کھینچ کر بیٹھا ہوں جس روز سے میں دستِ طلب — لوگ آآکے مرے پاؤں پہ سر رکھتے ہیں
ضعف منّت سے بھی چلنے نہیں دیتا دو گام — پیر جھک جھک کے بہت پاؤں پہ سر رکھتے ہیں
گھر میں ہیں گھر سے نکل کر بھی ہم اے حبِ وطن — نکہتِ گُل کی روش وقتِ سفر رکھتے ہیں
آگئی موت تو پھر غیر کا حصّہ ہے اُمید
مال جو عقل سے خالی ہیں وہ بھر رکھتے ہیں

شوق پہ سیرِ عدم کا کم نہیں — وہ چلے جاتے ہیں جن میں دم نہیں
دولت دارا و دورِ جم نہیں — ایک عالم پہ کبھی عالم نہیں
ہر گُل خنداں گریباں چاک ہے — واہ رونے سے یہ ہنسنا کم نہیں
فکرِ زائد کس لیے ہے اے اُمید
پاؤں پھیلانے کو تربت کم نہیں

خاقانی حکیم افضل الدین ابراہیم شروانی

حسّان عجم

(پروفیسر محمد عبدالقوی صاحب فانی لکھنؤ یونیورسٹی)

جو لوگ فارسی ادب سے ذوق رکھتے ہیں وہ خاقانی کے کلام سے ضرور آشنا ہوں گے۔ فارسی ادب میں خاقانی کے کلام کو ایک خاص درجہ حاصل ہے۔ پرانے مروّجہ نصاب فارسی میں خاقانی کے کلام کا مطالعہ ازبس ضروری خیال کیا جاتا تھا کہ بغیر اس کے فارسی ادب کی تحصیل ناقص سمجھی جاتی تھی اکثر اساتذۂ قدیم کے خاقانی کے قصائد کے جواب لکھے ہیں اور اس کے طرز کی پیروی کی کوشش کی ہے اور اس کو معراج کمال سمجھا ہے۔ فارسی کا کوئی مشہور شاعر ایسا نہیں گذرا ہے جس نے اس کو استاد نہ تسلیم کیا ہو اور خلاق معانی نہ مانا ہو حقیقت یہ ہے کہ تخلیق معانی۔ الفاظ کی شان و شوکت ر. دانی اور بندش میں کوئی اس کو نہیں پہونچا۔ اس کے کلام میں زور۔ خیالات میں جدت اور دقت پسندی بہت ہی تخئیل کی پختگی۔ چست بندش۔ بلند خیالی۔ موزوں ترکیبیں۔ جدید تشبیہیں اور استعارے اس کی عام خصوصیات ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس کا کلام عام فہم نہیں ہوتا ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ علوم و فنون کی اصطلاحیں۔ علمی اور تاریخی تلمیحیں اور مذہبی اشارے کثرت سے استعمال کرتا ہے جن سے فی زمانہ لوگ واقف نہیں۔

ادیب محترم آقای میرزا حسین خاں دانش اصفہانی مجلّہ (رسالہ) ایران شہر۔ شمارہ ۲۔ جلد ۳ صفحہ ۶۸ میں لکھتے ہیں۔

شاعریست جامع الاضداد و سخنوریست بلند نہادہ قصائدش طلاقت و طمطراقے دار د شاہانہ "

پھر لکھتے ہیں۔

" خاقانی دبدبۂ الفاظ را با طنطنۂ معانی یک جا ادا کردہ "

قاآنی جو شاہان قاچار ایران کے دور کا مشہور شاعر ہے فخریہ اپنے کو خاقانی ثانی لکھتا ہے اور اسی پر بس نہیں کرتا بلکہ بادشاہ کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ دیکھیے میرے کلام میں خاقانی کی روح بول رہی ہے۔

شاہا بہ قاآنی نگر خاقانی ثانی نگر ! نے روح خاقانی نگر اینک بہ گفتار آمدہ

اگلے زمانے میں پیشہ کرنا اور اپنی محنت کی کمائی سے زندگی بسر کرنا عیب نہ تھا۔ افضل الدین ابراہیم خاقانی کا باپ علی بڑھئی تھا۔ خود کہتا ہے۔

زدیوان ازل منشور کا دل درمیاں آمد سپہری حملہ راد اوند سلطانی بہ خاقانی
برائے حجت معنی بداہیمی بدید آمد زپشت آذر صنعت علی نجار شیروانی

دادا جولاہہ تھا۔ تحفۃ العراقین میں لکھتا ہے۔

جولاہہ نژادیم از سوئے جد

خاقانی کی ماں پہلے عیسائی تھی۔ پھر اسلام اختیار کیا۔ کہتا ہے۔

وز دگر سو چوں خلیل اللہ در دو گر زادہ ام بود خواہر گیر مریم مادر ترسائے من

وہ ۵۰۰ھ مطابق ۱۱۰۶ مسیحی میں بلاد شروان میں پیدا ہوا۔ اپنی جائے پیدائش اور نشو و نما کی جگہ کے متعلق لکھتا ہے۔

گفتا چہ کیے وچیست نامت اصلت زکجا۔ کجا مقامت
گفتم متعلمی سخنداں میلاد من از بلاد شرواں

ایک دوسری جگہ کہتا ہے۔

پروردہ نقرم مشیمہ دست نطقم قابلہ خاک شروان مولدم دار الادب منشائے من

خاقانی کا باپ نجاری کے علاوہ تابوت بھی بناتا تھا۔ اس کی ماں کا نام رابعہ تھا جو طباخہ تھی اس کے باپ کے انتقال کے بعد اس کے چچا نے جو طبابت کا پیشہ کرتا تھا اس کی تعلیم و تربیت اپنے ذمہ لے لی اور اس فرض کو پوری طرح ادا کیا۔ خاقانی بھی اپنے چچا سے بہت محبت کرتا تھا جب اس کے چچا کا انتقال ہوا خاقانی کو بہت صدمہ ہوا۔ اس نے بعض اشعار میں اپنے اس رنج کا اظہار

۵۱ خاقانی کو نام ۵۲ باپ کا نام ۵۳ جائے پیدائش ۵۴ مکتب ۵۵ جائے نشوونما

بھی کیا ہو لکھتا ہے۔

غم زجہان عبرہ و عبرت تو ایں بس است نتواں بامرگ غم برگ نغسم ساختن
چوں تو طریق نجات از درعسم یافتی شرط بود قبلہ گاہ مرقد عم ساختن

خاقانی کے والدین نے بھی اس کی اچھی تربیت کی تھی۔ چنانچہ خود کہتا ہے۔

ز ابتدا اسر بامک و بانگ بناز دیدیم چوں طفل زالہکہ ہم مامک رقیبم بود وہم بابائے من

خاقانی کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عربی اور فارسی علوم سے واقف ہے اور ان دونوں زبانوں کا ماہر ہے۔ مذہب کا پابند ہے اور صوفی مشرب ہے۔ لکھتا ہے۔

دانم علوم دیں نہ بداں تا بہ جنگ زرق کام از سگان جیفۂ دنیا بر آورم

بعض سوانح نگار لکھتے ہیں کہ خاقانی نے فن شاعری فلکی شروانی سے حاصل کیا ہے مگر دولت شاہ اپنے تذکرہ میں اسے تسلیم نہیں کرتا۔ شیخ العارف آذری جواہر الاسرار میں لکھتے ہیں کہ فلکی اور خاقانی دونوں ابوالعلا گنجوی کے شاگرد ہیں۔ یہی بیان صحیح مانا گیا ہے۔

چوں کہ اس زمانہ میں خاقان منوچہر کے دربار میں ابوالعلا کا عروج تھا خاقانی نے اس کی شاگردی اختیار کی۔ خاقانی پہلے حقائقی تخلص کرتا تھا۔ خاقان منوچہر کی صحبت اور اس کی قدردانیوں کے اثر سے اس نے اپنا تخلص خاقانی رکھا۔ حمداللہ متوفی اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں کہ ابوالعلا خاقانی کا خسر بھی تھا۔ داماد اور خسر میں کچھ ایسی ناگوار صورتیں پیدا ہوئیں کہ دونوں نے ایک دوسرے کی سخت ہجو لکھی اور تذلیل کی۔ حیرت تو یہ ہے کہ خاقانی باوجود صوفی مشرب اور عالم دین ہونے کے اپنے خسر کی نہایت رکیک ہجو لکھتا ہے۔ مگر روسی پروفیسر خانکاف کا بیان ہے کہ بارھویں صدی عیسوی کے ایرانی کا غصہ ایسا ہی ہوتا تھا۔ ابوالعلا خاقانی پر اپنا احسان جتاتا تھا اور کہتا ہے۔

بہ خاقانیت من لقب بر نہادم ترا دختر و مال و شہرت بدادم

خیال کیا جاتا ہے کہ ۲۵ سال کی عمر میں خاقانی کی رسائی خاقان شروان شاہ اخستان ابن منوچہر کے دربار میں ہوئی۔ سلطان خاقان اس کو بہت عزیز رکھتا تھا اس کی بہت قدر کرتا تھا اور اس کو کہیں

باہر جانے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ اس کا حکم تھا کہ ہر قصیدہ پر ایک ہزار اشرفیاں دی جائیں۔ آخر عمر میں خاقانی پر فقر و تصوف کا رنگ زیادہ غالب ہو گیا تھا۔ اس نے دربار شاہی میں اپنا استعفا پیش کیا جسے خاقان نے نامنظور کر دیا۔ خاقانی موقع پا کر شروان سے بھاگ نکلا مگر گرفتار کر لیا گیا اور اس جرم میں سات ماہ تک قید رہا۔ خاقان کو اس کی جدائی نہایت شاق تھی اور اس نے خاقانی کو سفر حج سے بھی روک دیا تھا۔ چنانچہ کہتا ہے۔

امسال گر ز کعبہ مرا باز داشت شاہ زین حسرت آتشے ز سویدا بر آوردم

بعض سوانح نگاروں کا خیال ہے کہ خاقانی ایک انگوٹھی کی وجہ سے قید ہوا تھا۔ خواجہ جمال الدین موصلی ملک الوزرا نے خاقانی کو ایک انگوٹھی دی تھی جس کے نگینہ پر اسم اعظم کندہ تھا۔ بادشاہ نے خاقانی سے یہ انگوٹھی مانگی تھی اس کے انکار کرنے پر وہ قید کر دیا گیا۔ انگوٹھی کا قصہ خود خاقانی نے تحفۃ العراقین میں نظم کیا ہے مگر اس میں اس کا کہیں ذکر نہیں ہے کہ انگوٹھی نہ دینے پر بادشاہ نے اسے قید کر دیا۔ یہ عذر ہو سکتا ہے کہ ڈر کے مارے اس نے اس کا ذکر نہ کیا ہو مگر جب ہم دیکھتے ہیں کہ اس نے اپنے اس قصیدہ میں جس کا مطلع یہ ہے۔

صبحدم چوں کلہ بند د آہ دود آسائے من چوں شفق در خوں نشیند چشم شب پیمائے من

خود بادشاہ وقت کے اور ان لوگوں کے جو اس کی قید کا باعث ہو رہے تھے نڈر ہو کر خلاف لکھا تو پھر اسے اس کے ذکر سے کوئی چیز مانع نہ ہو سکتی تھی۔ یہ البتہ ممکن ہے کہ بادشاہ کو اس کا استعفا ناگوار ہوا ہو اور اس نے قید کر دیا ہو۔ سلطان سنجر کی فیاضیاں سن کر خاقانی چاہتا تھا کہ اس کے دربار میں پہونچے۔ مگر کامیاب نہ ہوا۔ خاقانی قہستان بھی جاتا ہے۔ شاہی دربار تک باریابی نہیں ہو سکی۔ ملک الوزرا جمال الدین موصلی اس کو ایک قیمتی انگوٹھی دے کر اس کی زیادہ ہمت افزائی نہیں کرتا۔ شروان واپس آتا ہے۔ خاقان منوچہر شروان کو ان سب امور کی اطلاع ہوتی ہے وہ انگوٹھی مانگتا ہے خاقانی انکار کرتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ چونکہ خاقانی دوسرے مربیوں کی تلاش میں رہتا تھا بادشاہ اس کو جانتا تھا اس کو یہ باتیں ناگوار تھیں اس لیے اس نے اس کو قید کر دیا ہو۔ خاقانی خراسان بھی گیا تھا اور یہ سلسلہ رسالت عراق بھی گیا،

خاقانی کے ایک دس سالہ لڑکے رشید کا انتقال اس کی زندگی میں ہوا جس سے اس کو سخت صدمہ پہونچا۔ آخر میں اس کی بیوی نے بھی اس کو ہمیشگی کا داغ مفارقت دیا اور خاقانی تارک الدنیا ہوکر تبریز میں گوشہ نشیں ہوگیا اور ۵۸۲ھ مطابق ۱۱۸۶ء میں اس کا دنیا انتقال ہوا۔ لیکن حبیب اسیر کی روایت یہ ہے کہ وہ ۵۹۰ھ میں زندہ تھا۔ آقائی میرزا حسین خاں دانش لکھتے ہیں کہ خاقانی کی وفات ۵۹۵ھ مطابق ۹۹-۱۱۹۸ء میں ہوئی یہی زیادہ صحیح ہے تبریز کے قبرستان سرخاب میں مقبرۃ الشعرا میں مدفون ہے۔ اس کے پاس ہی ظہیر فاریابی اور ملک الشعرا شاہ غفور کی قبریں ہیں۔

خاقانی کے معاصرین رشید وطواط۔ ظہیر فاریابی، مجیر الدین بیلقانی، کمال الدین نخجوانی شاہ غفور نیشاپوری۔ نظامی گنجوی اور ذوالفقار شروانی وغیرہ تھے۔

در شعر سہ تن پیمبر انند　　ہر چند کہ لا نبی بعدی
ابیات و قصیدہ و غزل را　　خاقانی و انوری و سعدی

خاقانی کو اپنی شاعری پر خود بھی ناز تھا اور وہ اس پر فخر بھی کرتا ہے۔ چنانچہ کہتا ہے۔

مالک ملک سخن خاقانیم کز گنج نطق　　دخل صد خاقاں سزد یک نکتہ غرائے من
گر بہ ہفت اقلیم گوید کس بمثل ایں دو بیت　　کافرم در ار النعام مسجد اقصائے من
شاعراں راگرچہ غاوون خواند در قرآن خدائے　　ہم ازایشاں بود ظاہر وجہ استثنائے من

ایک دوسری جگہ کہتا ہے۔

زیں دم معجز نما مگذری خاقانیا　　کز سر ایں دم تواں زاد عدم ساختن
یوسف دلہا توئی کایت قسمت از سخن　　پیش گرسنہ دلاں خوان کرم ساختن

یہ امر مسلمہ ہے کہ قصائد میں اس کا پایہ بہت بلند ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو واقعہ نگاری میں بھی وہ استاد یگانہ ہے۔ اس کی بہترین مثال طاق کسریٰ کا بیان ہے۔ حج کو جاتے ہوئے وہ مدائن سے گذرا۔ طاق کسریٰ کی ٹوٹی پھوٹی حالت سے بہت متاثر ہوا ایک قصیدہ لکھا جو اسی درد و اثر

میں ڈوبا ہوا ہی جو اس کے دل میں تھا۔ اس میں واقعہ نگاری کے علاوہ تخئیل کی میناکاری بھی کی گئی ہی۔ قصیدہ کیا ہی طاق کسریٰ کا ایک نہایت پر درد مرثیہ ہی۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

ہاں اے دل عبرت بیں از دیدہ نظر کن ہاں — ایوان مدائن را آئینۂ عبرت داں
یک رہ ز لب دجلہ منزل بہ مدائن کن — از دیدہ دوم دجلہ بر خاک مدائن راں
خود دجلہ چناں گرید صد دجلۂ خوں گوئی — کز گرمی خونابش آتش چکد از مژگاں
گوید کہ تو از خاکی ما خاک تو ایم اکنوں — گامے دو سہ بر ما نہ و اشکے دو سہ ہم بفشاں
کسریٰ و ترنج زر۔ پرویز و ترۂ زریں — بر باد شدہ یکسر با خاک شدہ یکساں

خاقانی نے اپنے بعض احباب کے مراثی لکھے ہیں جو درد و اثر میں ڈوبے ہوے ہیں جب اس کا دس برس کا لڑکا رشید بیمار تھا خاقانی نے یہ اشعار لکھے تھے۔

آں جگر گوشۂ من نزد شما بیمار است — دوش دانید کہ چوں بود خبر باز دہید
ہمہ بیمار نوازان مسیحا نفسید — مدد روح بہ بیمار جگر باز دہید
در علاجش بہ بہینا شمائید نگر — کاتش حسن مداواں سبز مجمر باز دہید
نہ نہ بیمار کجا ست و امید بہی است — بد بتر شد ہمہ اسباب ضرر باز دہید
سبزہ رنگ سر عیار وہ شب تب زدہ بود — تب خدنگ اجل انداخت سپر باز دہید

عام طور سے چونکہ اس کے صرف قصائد درس میں پڑھائے جاتے ہیں یہ غلط خیال قائم ہوگیا ہی کہ اس کے کلام میں اثر نہیں۔ خرابۂ مدائن پر اس نے جو قصیدہ لکھا ہی یا اپنے اعزہ اور احباب کے مرثیے لکھے ہیں وہ نہ صرف اثر و درد سے بھرے ہوے ہیں بلکہ اس کے ساتھ ہی سہل ممتنع کی حد تک پہونچے ہوے ہیں۔ جب خاقانی سات ماہ تک قید رہا تھا تو اس نے جو قصیدہ قید خانہ کی شکایت میں قید خانہ میں لکھا تھا وہ بھی اثر اور واقعہ نگاری کی اچھی مثال ہی اس کا مطلع یہ ہی۔

صبحدم چوں کلّہ بندد آہ دود آسائے من — چوں شفق در خوں نشیند چشم شب پیمائے من

اس کی شاعری حکمت و غنائق اور حقائق و معارف کے بیان سے بھی مالا مال ہی نمونتہً ایک قصیدے کے چند شعار نقل کیے جاتے

ہیں بلندیٔ خیال، قدرتِ مقال، حُسنِ بندش اور زبان کی سادگی بھی قابلِ غور ہے، کہتا ہے۔

سُنّتِ عشاق چیست برگِ عدم ساختن — گر بہرِ دل را زتف مجمرِ غم ساختن
مدرقہ چوں عشق گشت از بس و بس ساختن — تفرقہ چوں جمع گشت باکم و کم ساختن
گرچہ سرِ نوائے جہاں خارجِ پردہ رود — چوں تو دریں مجلسی با ہمہ دم ساختن
در نتواں در خطِ دہر وفا یافتن! — در نتواں بر سطحِ آب نقشِ قلم ساختن

اُستادِ کلی میرزا غالب فرماتے ہیں۔ قصیدہ گوئی کی ابتدا خاقانی سے ہوئی اور انتہا قاآنی پر۔ انگلستان کے دو مشہور شاعر ملٹن اور ٹینی سن میں باعتبار زبان۔ طرزِ بیان۔ حلاوت ادا مضمون آفرینی اور بلند خیالی میں جو فرق ہے وہی نسبت قاآنی کو خاقانی سے ہے۔ خاقانی اپنے وقت کا ملٹن ہے اور قاآنی ٹینی سن۔

افسوس ہے کہ خاقانی کے قصائد پر بخوفِ طوالت اس مختصر مضمون میں تفصیل سے نظر نہیں ڈالی جا سکی اور نہ ان کے محاسن دکھائے جا سکے مگر حق یہ ہے کہ قصائد میں کوئی اس کا ہمسر نہیں اور نہ اس شاہانہ شان اور دبدبہ کے کسی نے قصائد لکھے ہیں۔

اس حقیر نے بھی خاقانی کے اُس قصیدے کے طرز میں جس کا مطلع ہے۔

اے فتنہ بر تو ایمن و تو فتنہ بر آئنہ — مارا نگاہ در تو ترا اندر آئنہ

طبع آزمائی کی ہے مگر بحر دوسری ہے۔ خاقانی نے مضارع مثمن اخرب میں قصیدہ لکھا بندہ نے رمل مثمن محذوف میں۔ چند اشعار حاضر ہیں۔

اے رُخِ تو کردہ رشکِ مہرِ تاباں آئنہ — فتنہ زلفِ عنبرینت شورِ عنبر آئنہ
چوں نباشد جشن در گورِ سکندر روز و شب — چہرہ اُت کردہ شہا فردوس منظر آئنہ
عکسِ تمثالِ آئنہ را چشمۂ جادو نمود — کردہ زاں بہرِ مہر طلعت را مسخر آئنہ
شد مشرف زانکہ از چہرہ پُر نورِ تو — چوں نہ باشد شاہداں را روح پرور آئنہ
اکتسابِ حُسن چوں کرد از رخِ زیبائے تو — پیشِ رو دارند حوراں نیز اکثر آئنہ

شوکت صاحب قرانی ہست در عثمان علی[1] | چوں نباشد پیش رویش نیز مضطر آئینہ
استعارت کرد از روئے تو شاہا آں قدر | می نہد خود را بہ مہر و مہ برابر آئینہ
در نظام ملک ہستی بے عدیل و بے مثال | قوت تدبیر تو گر دست کشور آئینہ
تا میہ در عہد زرینت چناں افزوں شدہ | بال و پر پیدا نمودہ چوں کبوتر آئینہ
در دکن دارد چو ہر کس زیب و زینت لاجرم | شل عشاق ست اکنوں حسن پرور آئینہ
شوکت عثماں فزائی نیز شان حیدری | کردہ اللہ از نام تو عثمان و حیدر آئینہ
قانی محزوں کہ در آفات ہر دم مبتلا | می نہد ز احوال بدتر پیش داور آئینہ
نیک بیت پائندہ دارد نام نیکت در جہاں | اندریں معنی ہمانا ہست رہبر آئینہ
آئینہ آئین زناں مرداں چہ پروا از زناں | زاں شہ کردہ از رخ شمشیر حیدر آئینہ
ہم تو ہستی با ہمہ آئین حیدر در وفا | ہست زیبا گر نہ کردی زیب و زیور آئینہ
گرچہ دارد پادشاں و شوکت صاحبقراں | از جلال روئے تو گردید مضطر آئینہ
در پناہت خلق می آید ز ہر سوئے جہاں | مثل مرغاں کرد پیدا نیز شہپر آئینہ
آئینہ بیند چوں بیند ماہ ز چرخ | لیک از روئے تو گشتہ نیک اختر آئینہ
شادمانی در جہاں بادا با این جاہ و حشم | تا بدارد در جہاں نام سکندر آئینہ

یہ قصیدہ جس میں کے چند اشعار اوپر نقل کیے گئے ہیں۔ اعلیٰ حضرت حضور نظام شاہ میر عثمان علی خاں بہادر خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ فرمانروائے ممالک برار و دکن کے لیے لکھا گیا تھا۔ اس سے ناظرین کو پورے قصیدے کا کچھ اندازہ ہو سکے گا۔

ہمراہی کی خریداری آپ کا قومی و اخلاقی فریضہ ہے

[1] اعلیٰ حضرت میر عثمان علی خاں نظام۔

آزادی ہند

دن خوشی کا آج ہی ہم کو حکومت مل گئی
قبضہ میں آیا خزانہ دل کو راحت مل گئی
فوج پائی مضمحل اعضا کو طاقت مل گئی
چین کالوں کو ملا گوروں کو فرصت مل گئی

ہی تر انے سے وطن کے مست نغمہ بینڈ کا
ہم کو ہندستاں ملا ان کو ٹکٹ انگلینڈ کا

لیڈیاں ہوتی ہیں رخصت الوداع والفراق
ہیں جہاز آگے رواں اور پیچھے چشم اشتیاق
آج آزادی حقیقت ہی جو کل تک تھی مذاق
مندروں میں جو ملیں لاؤ بھر دمسجد کے طاق

اے شفق تیور اب اچھے ہیں ترے رنجور کے
چھاپے دے کوہ ہمالہ پر ذرا سیندور کے

بارک اللہ اب زمین و آسماں آزاد ہی
بارک اللہ ہر نہال گلفشاں آزاد ہی
دست برد باغباں سے آشیاں آزاد ہی
بارک اللہ پانڈوں کا ہندوستاں آزاد ہی

ہو چکی تھی دفن جو دل میں تمنا جی گئی
پھر اشوک و بابر و اکبر کی دنیا جی گئی

لے ہوا آزاد سانس لے کہ تو آزاد ہی
اب قلم آزاد ہی اب گفتگو آزاد ہی
دلی کا خم خانہ و جام و سبو آزاد ہی
لال قلعہ کیوں نہ ہو اب سرخرو آزاد ہی

دل تھا غم گیں مادر ہندوستاں کے بین سے
نیند آئے گی بہادر شاہ کو اب چین سے

(شاعر لکھنوی)

"آتشِ خاموش"

(از مرزا فدا علی خنجر لکھنوی)

کالج میں تعطیل ہو چکی تھی، طلبہ، تھکے ہارے قلب و دماغ کی تفریح و تازگی کے لیے مختلف مقامات پر منتشر ہو چکے تھے۔ میں نے دیہات کا انتخاب کیا تھا شہری ہنگاموں میں لیل و نہار گزارتے گزارتے کچھ تھک سا گیا تھا دل چاہتا تھا کسی سہانی فضا میں چند روز پرسکون خاموشیوں سے کیف و سرور حاصل کروں۔

یہی آرزو کشاں کشاں مجھے یہاں کھینچ لائی یہ مختصر سا خوش منظر قصبہ ہے ہفتہ میں دو دن بازار لگتا اور ضرورت کی چیزیں مل جاتی ہیں۔ مجھے بازار سے دلچسپی نہ تھی۔ ہنگاموں ہی سے تنگ ہو کر آیا تھا۔ اس لیے خلیل بھائی کے مکان کا وہ حصہ پسند کیا جو پھلواری کی جانب سب سے الگ تھلگ واقع ہوا تھا۔ خلیل بھائی نے بارہا وہاں کے معتبر حضرات سے متعارف کرنا چاہا لیکن میں نے مختلف حیلے حوالوں سے ٹال مٹول کر دی۔ آخر انھوں نے بھی میری خلوت پسندی سے آگاہ ہو کر مصر ہونا ترک کر دیا۔ مزید عنایت یہ فرمائی کہ جب تک میں خود اُن کی خدمت میں حاضر نہ ہوتا وہ میری پرسکون خلوت میں دخل اندازی نہ کرتے۔ اب میرے روز و شب نہایت اطمینان سے بسر ہونے لگے۔ علی الصباح جب آفتاب کی پہلی کرن مولسری کی سب سے اونچی پھننگی پر رقص جاری کرتی تو میں بستر سے اٹھ کر پھلواری کے رُخ کھلنے والے جھروکے میں جا بیٹھتا۔ قدرت کی موسمی سخاوتیں روح کو بالیدہ کرتیں۔ اعضاء و جوارح تازہ روح کی کارفرمائی سے چاق و چوبند ہو جاتے۔ آفتاب آہستہ آہستہ نقابِ شب سرکا کر روشنائی کرتا۔ دھوپ بڑھتی، پھیلتی اور خوابگاہ مغرب میں خوابیدہ ہو جاتی زندگی کے لیل و نہار راہ باغ سے بلند ہونے والے دلپذیر قہقہوں میں گھلتے ملتے چلے گئے۔ اوّل اوّل تو ان قہقہوں کو سن کر ناگواری کا احساس کرتا رہا پھر رفتہ رفتہ معادات ہوتی گئی۔ اب نہ صرف ان قہقہوں کا تحمل ہی پیدا ہوا بلکہ اُن سے دلچسپی بھی لینے لگا۔ بعض دفعہ دیر بھی یہ حسین قہقہے سامعہ نواز ہوتے تو جستجو ہوتی اور قلب کے گوشہ میں دبکی دبکائی خواہش فضا کو گونجتا ہوا سننے کا تقاضا کرتی۔

شام ہونے میں تھوڑا سا وقفہ تھا سنہری دھوپ بساط ارض سے سمٹ سمٹ کر قد آور درختوں پر چڑھنے لگی تھی۔ میں چہل قدمی کرتا ہوا چمن میں جا نکلا۔ انواع و اقسام کے موسمی پھول رنگ برنگی قباؤں میں نازک نازک شاخوں پر شگفتگی کی بہاریں لٹانے میں مصروف تھے

مولسری کی چھاؤں میں دیدۂ منتظر کی طرح خاموش بچھی بنچ پڑی تھی۔ میں ٹہلتا ہوا بنچ پر جا بیٹھا ننھی ننھی چڑیوں کے غول چہچہا کر بسیرا لینے گھونسلوں کی سمت واپس ہو رہے تھے۔ اُن کے معصوم چہچہوں سے فضا ترنم ریز ہو گئی تھی اور سامنے ہی ایک گل اندام دوشیزہ جھکی ہوئی تھالوں میں پانی دینے کا فرض ادا کر رہی تھی۔ اس کے فرحناک قہقہے خوش نوا طائروں کی نغمہ سنجیوں میں گھُل مل کر مسحور کن سماں پیش کر رہے۔

وہ بھرپور جوان تھی۔ اُس کا گداز جسم اور متناسب اعضا حُسن و شباب کا عدیم النظیر مرقع تھے۔ درحقیقت وہ قدرت کی قلم کاریوں کا نادر نمونہ معلوم ہوتی تھی تاہم فطری سادگی اور معصومانہ ذہنیت نے ہنوز راز حُسن سے آشنا ہونے کا موقع نہ دیا تھا۔

بوڑھا مالی جس نے زندگی کے پینسٹھ سال کمال مستعدی سے پھلواری کی خدمت میں صرف کر دیئے تھے اب امراض کے حملوں اور ضعف پیری سے اس قابل نہ رہا تھا کہ باغ کی دیکھ بھال کا فریضہ پورا کر سکتا۔ اس لیے یہ خدمت اکلوتی بیٹی کے سپرد کرتے ہوئے اپنے واسطے دو چیزیں منتخب کر لی تھیں ایک تو اپنی کُٹیا میں بیٹھ کر ناریل کے کش کھینچنا دوسرے گھُر گھُر کھانسنا اور یہ دونوں کام صبح سے شام تک مسلسل جاری رہتے۔

جفاکش نازنین۔ باپ کے حکم کی تعمیل میں سر تا سینہ ایڑی تک بہاتی رہتی۔ شاید اُس نے سنگین کام کو حسین قہقہوں میں گم کر دینا طے کر لیا تھا۔ جب ہی تو ہر وقت کھلکھلاتی رہتی تھی! اس کی اس خصلت نے مجھے اس کے فاترالعقل ہونے کا یقین دلا دیا تھا مجھے اُس کے حسن و شباب کا قلق تھا۔ آہ! قدرت کی ستم ظریفی بھی عجیب تھی کہ انمول نعمتیں دے کر اُن کے لطف سے محروم کر دیا۔

میں نے اُسے ہنسنے کے سوا کبھی کسی سے ہم کلام ہوتے نہیں سُنا۔ منصبی کام کے ساتھ قہقہے لگانا ہی اُس کے واسطے سب کچھ تھا۔ میں بنچ پر بیٹھا اس کے متعلق سوچ رہا تھا۔ وہ مجھ سے آٹھ دس گز کے فاصلے پر تھالے درست کرنے میں مشغول تھی۔ اوڑھنی سر سے ڈھلک کر مفروضہ کاموں میں مخل ہو رہی تھی۔ اس لیے اُسے دونوں شانوں پر ڈال لیا تھا۔ شدید محنت سے پیاری پیاری جبین عرق آلود ہو چکی تھی تاہم وہ ہاتھ روکے بغیر کام کیے جا رہی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ فضا میں گاہ تبسم کی کلیاں کھلتیں کبھی دل فریب قہقہوں کا رس گھلتا محسوس ہوتا یوں تو شادمانیوں کی دیوی ہمیشہ ہی اس پر سایہ فگن رہتی تھی پھر اس وقت نسبتہً زیادہ مسرور نظر آ رہی تھی۔ میں اس حسین تتلی کے تماشائے جمال میں محو تھا اور وہ گاہ بگاہ کنکھیوں سے میری جانب نگاہوں کے بان پھینکتی

جاتی تھی۔

میں دل ہی دل میں اُس کے جنون اور گونگے پن پہ متاسف ہوتے ہوئے نہ معلوم کب اور کیسے! اُسے آواز دے کر ہاتھ کے اشارے سے اپنی جانب بلانے لگا! وہ میری پکار سُن اور اشارا دیکھ کر چونک سی پڑی۔ پھر چُپ چاپ تبسّم ریزیاں کرتی ہوئی سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔

"تم کو ہنسنے کے سوا بولنا بھی آتا ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

جواب میں اُس نے فلک بوس قہقہہ لگایا لیکن مُنھ سے ایک لفظ نہ بولی، چہرے کے اُتار چڑھاؤ سے نمایاں تھا کہ میرے الفاظ گو وہ سماعت تک پہنچ گئے ہیں لیکن جواب دینے کا یارا نہیں رکھتی۔

میں نے پھر چھیڑ کے طور پر مُسکراتے ہوئے کہا "اچھا، تو یہ کہو؛ تم پگلی ہی نہیں گونگی بھی ہو!"

اُس نے کسی قدر حیرت سے میرا مُنھ تکتے ہوئے کہا "گونگی!" اور ہنستے ہنستے بے تاب ہوگئی۔

اب معلوم ہوا کہ وہ گونگی تو تھی لیکن سنکی مزاج ہونے میں شبہہ نہ تھا۔ خواہ مخواہ ہنستے رہنے کا مطلب تو یہی نکلتا ہے۔ چند لمحے ساکت رہ کر میں نے پھر کہا "تم ہر وقت ہنسا کیوں کرتی ہو؟"

"تم ہر وقت ہنسا کیوں کرتی ہو؟" اُس نے میرا فقرہ دُہرایا اور اتنا ہنسی کہ میں نے جانا کہ ہنستے ہنستے گر پڑے گی! پھر ہنستے ہوئے اعجاز سے بولی۔ "ہنستی نہ ہو تو کیا رویا کروں؟"

مجھے اُس سے اتنے برجستہ جواب کی توقع نہ تھی۔ سچ تو ہے "ہنسے نہ تو کیا رویا کرے؟" آخر ہنسنا کوئی جرم یا معصیت تو ہے نہیں۔ اس کے معصوم لبوں سے نکلے ہوئے الفاظ میرے سامعہ میں گونج رہے تھے۔ میں شہر کا تیز و طرار طالب علم، دیہات کی سیدھی سادی چھوکری سے مات کھا جاؤں! بالکل عجیب بات ہے! پھر طور حیلہ بناتے ہوئے میں نے کہا۔ "میرا یہ منشا نہ تھا جو تم نے سمجھا — خیر! تمھارا نام؟"

"کنول" سادہ سا جواب دے کر وہ ہنستی مسکراتی اپنے کام میں مشغول ہوگئی۔ میں نے قبل ازیں اُس کے متعلق جو رائے قائم کی تھی وہ اتنی گفتگو کے بعد تبدیل ہوگئی۔ فی الواقع وہ گونگی تھی نہ دیوانی۔

اب میں روزانہ کمرے سے نکل کر مولسری کے سایے میں جا بیٹھتا مُنھ سے سیٹی بجانے یا اشعار گنگنانے کا مشغلہ جاری رہتا۔ کنول اپنے فرائض میں اُلجھی رہتی نہ محنت سے تھکتی نہ قہقہوں سے باز آتی! مجھے گزشتہ زندگی میں اکثر ہنس مکھ، خندہ جبیں دوشیزائیں دیکھنے

کا اتفاق ہوا لیکن حقیقت میں آفتاب کی تکان جھیلنے والی والی لڑکی کی نظر سے نہ گزری تھی! شاید اس نے اپنی زندگی محنت اور قہقہوں کے واسطے وقف کر دی تھی۔

ایک روز مولسری کے سائے میں بیٹھا سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ دھواں چھلّے بناتا ہوا نہ جانے کہاں اوپر چلا جاتا تھا۔ کنول تھوڑی دور پر اپنے دونوں فریضے ادا کرنے میں مصروف تھی۔ وہ خوش منظر تتلی کی طرح ایک پھول سے دوسرے پھول کی طرف لپکتی معلوم ہوتی تھی۔ لب ہائے لعلین پر مسکراہٹ، ہنسی، قہقہے باری باری سے جلوہ ریزی کرتے جاتے تھے۔ اس کا باپ وہاں سے دور کٹیا میں نارئیل کے دم لگانے اور گھر گھر کرنے میں مگن تھا۔ کھانسی کی صدا دوش نسیم پر اڑتی ہوئی اس مقام تک پہنچ رہی تھی۔

چودھویں کا چاند حسین رعنائیوں سمیت جلوہ آرا ہو چکا تھا۔ شمیم کے لطیف جھونکے شاہدان چمن سے اٹکھیلیاں کر رہے تھے۔ اشجار نورانی حلّوں سے آراستہ ہو چکے تھے۔ میری تفریح چمن کا ہنگام ختم ہو چکا لیکن منظر کی جاذبیت نے باندھ کر بٹھا رکھا تھا اور میں ہوٹل کی کیفیتوں سے اس طرب آفریں سماں کا تقابل کرنے میں گم تھا۔ یہ صحیح ہے کہ شہر کا سواد پر بھی قدرت کی دی ہوئی یہی قندیل نور پاشیاں کرتی ہے لیکن جو دل کشی دیہات کے خاموش میدانوں، پرسکون، سبزہ زاروں یا لہلہاتے ہوئے کھیتوں میں پائی جاتی ہے وہ ہنگامہ پرور مقامات میں نام چار کو نہیں ہوتی

میں خیالات میں غرق تھا، چاندنی کیفیت کیے تھی، اس کی روشنی میں پیڑ پتے، بیل پھول صاف نظر آ رہے تھے۔ دفعتہ نغمہ کی صدا نے ربودگی کا طلسم توڑ ڈالا۔ کنول کسی کنج میں بیٹھی گا رہی تھی ؎

"آج کی رین چندا تم اگیو ——— چندا تم اگیو
سورج تم مت اگیو ——— آج کی رین ———"

کتنی پیاری آواز اور کتنا رسیلا گیت تھا؟ وہ لطیف منظر کی سحر بیت سے مسحور ہو کر تمنا کر رہی تھی کہ آج کی رات طویل گیسو کی طرح طویل ہو جائے اور بلبل قمر کی طرب افزا رل اسی نورانیت کے ساتھ قائم رہیں، وہ سورج سے بھی التجا کرتی تھی کہ تم طلوع نہ ہونا۔ کتنے پاکیزہ جذبات تھے؟ ان کی سماعت کے بعد بیٹھا نہ گیا بنچ سے اٹھ کر آواز کی سمت روانہ ہو گیا۔ ارادہ تھا کہ چھپ کر سنوں لیکن جس کنج میں وہ بیٹھی سُر کا مینہ برسا رہی تھی اس کے آس پاس خشک پتیوں کا فرش سا بچھا تھا۔ پاؤں کا دباؤ پڑتے ہی وہ چر مرانے لگیں اور کنول میرے دبے پاؤں آنے سے خبردار ہو گئی۔ وہ ایک دلنواز قہقہے کے ساتھ ساکت ہو گئی۔ اس کے ہاتھوں میں پھولوں کا نفیس گجرا تھا یہ گجرا ابھی ابھی رسیلے گیت کے ساتھ بن کر تیار ہوا تھا۔ میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے تعریفی انداز سے کہا۔ "بیچ کیوں

ہوگئیں کنول! تم تو بہت اچھا گا لیتی ہو ـــ ہاں، یہ گجرا تو خوب بنا ہے!"

اُس نے وہ خوب صورت گجرا میری طرف بڑھایا پھر مقابل کھڑی ہو کر مسکرانے لگی۔ میں نے کہا۔ "گجرا تو بہت پیارا بنایا ہے، بھلا اسے کتنوں داموں میں بیچو گی؟"

اس نے بدستور کھلکھلاتے ہوئے جواب دیا۔ "یہ گجرا بکری کا نہیں ہے لیکن آپ لے سکتے ہیں۔"

میں کچھ دیر اُس کی بھولی بھولی پیاری صورت کی طرف تکتا رہا پھر غیر ارادی طور پر اُس سے متصل ہوتے ہوئے بولا "کنول! تمھیں یہ گجرا میرے گلے میں پہنا دو۔"

"ارے! آپ اتنا ہلکا پھلکا گجرا بھی اپنے ہاتھ سے نہیں پہن سکتے؟" وہ کمال سادگی سے بولی "لائیے میں ہی پہنا دوں ـــ آپ نرے شہری ہی معلوم ہوتے ہیں!"

اُس کے بھولے طنز نے مجھے تدرو وحش کی طرح سرشار کر دیا وہ جواب کا انتظار کیے بغیر اپنی جگہ سے کچھ آگے بڑھی اور میرے ہاتھ سے گجرا لے کر پہناتے ہوئے ہنسنے لگی۔ اُس کا مُنھ کھلنے سے ایسا نظر آیا جیسے دانتوں کے بجائے چاند کے ٹکڑے جڑ دیئے گئے ہیں! میں مسحور ہو کر بولا "کنول دیکھو تو سہی کیسی چاندنی چھٹکی ہوئی ہے؟ کتنی خوش گوار ہوا ہے اور کس قدر بھینی بھینی خوشبو ہے کہ روح بالیدہ ہوئی جاتی ہے، انتاجیں تک کیف و سرور میں جھوم رہی ہیں، بیلیں خود رفتہ ہو ہو کر درختوں کے تنوں سے لپٹ گئی ہیں۔ کیا تمھارے دل پر کوئی کیفیت طاری نہیں ہوتی؟"

وہ مستانہ قہقہہ لگاتی ہوئی بولی "یہ تو کوئی نئی بات نہیں۔ ایسا سدا ہی ہوا کرتا ہے۔"

"آہ کنول! تم نہیں جانتیں" میں نے خود فراموشی کے عالم میں کہا "تم نے سچ کہا کہ ایسا سدا ہی ہوا کرتا ہے! مگر آج کچھ اور ہی بات ہے۔ اس کا مزہ دل ہی جان سکتا ہے۔ سچ کہنا اس وقت تمھارے دل میں کوئی نئی کیفیت تو ہلچل نہیں مچا رہی ہے؟ کیا یہ خوب صورت اور دلآویز چاندنی تم پر اثر انداز نہیں ـــ؟ دیکھو سچ سچ بتانا چھپانے کی سند نہیں۔"

وہ پھر ہنس پڑی اور ہنستے ہی ہنستے جواب دیا "نہ جانے آپ کو کیا ہو گیا ہے جو بہکی بہکی باتیں کر رہے ہیں؟"

وہ ہنس رہی تھی ـــ ہنستی ہی جا رہی تھی! نہ معلوم کیوں! کس بات پر؟ اُس کے خاطر پذیر قہقہوں سے فضا مرتعش تھی اور میں پیکر تصویر بنا پیاسی نظروں سے اُس کی موہنی صورت تک رہا تھا۔

میری چاندنی راتیں مولسری کے سائے میں روح پرور خواب کے مانند گزرنے لگیں۔ کنول میرے قریب بیٹھی گجرا بنانے اور ہنسنے میں مشغول رہتی۔ میں کبھی گاؤں، کبھی پھولوں اور

پودوں کے متعلق سوالات کرتا رہتا۔ وہ ہنس ہنس کر پھول کی بارش کیا کرتی۔ میرے سوالوں کا جواب دیتے دیتے اُس کے چہرے کی رنگینیاں کچھ اور گہری ہو جاتیں۔ وہ بار بار ہنستی اور ہنستے ہنستے لوٹ جاتی۔ میں نیم خوابی کی حالت میں اس کی سادہ و پُرکار اداؤں سے محظوظ ہوا کرتا۔

انھیں لطیف مشغلوں میں لیل و نہار گزرتے گئے تعطیل کا زمانہ قریب ختم اور میری روانگی کا وقفہ بقدر دو یوم رہ گیا۔ میں نے ایک دن باتوں باتوں میں کنول پر ظاہر کر دیا کہ "کالج کھلنے والا ہے۔ مجھے دو ایک دن میں گاؤں چھوڑ کر شہر جانا پڑے گا"۔

کنول بغور سنتی اور مسکراتی رہی لیکن اس تبسّم میں آزردگی کی جگہ پھیکا پن زیادہ نمایاں تھا۔ مجھے بخوبی احساس تھا کہ وہ آہستہ آہستہ میرے نزدیک ہوتی جا رہی ہے۔ یہ بھی جانتا تھا کہ قصبہ سے میری روانگی اس سادہ نازنین کے معصوم دل میں ہلچل پیدا کرے گی لیکن جانا ناگزیر تھا کیونکہ تعلیم پوری نہ کرنے سے مستقبل تاریک ہو جانے کا اندیشہ قوی تھا

روانگی کے روز میرا سوٹ کیس اور بستر بیل گاڑی پر رکھ دیا گیا۔ بہلی دھول اُڑاتی ہوئی اسٹیشن کی جانب روانہ ہو گئی۔ پھلواری کا پھاٹک آتے ہی میں بہلی سے کود کر کنول سے رخصت ہونے کو لپکا۔ وہ ہاتھ میں کھرپی لیے کیاریاں درست کر رہی تھی۔ میں نے عقب سے جا کر اس کی آنکھیں بند کر دیں۔ اُس نے کھلکھلاتے ہوئے میرا ہاتھ آنکھوں سے جدا کر دیا۔ پھر سامنے سیدھی کھڑی ہو گئی۔

"کنول! اب میں جا رہا ہوں" میں نے کہنا شروع کیا "کسی طویل چھٹی میں یہاں آنے کی کوشش کروں گا ـــ ہاں نشانی کے طور پر تمھارے لیے ماتھے کی بندی لایا ہوں۔ اسے یادگار تصوّر کرنا"

اُس نے ہاتھ پھیلا کر بندی لے لی اور اس انداز سے تکنے لگی جیسے کچھ کہنے والی ہے لیکن تاب گویائی ساتھ نہیں دیتی اگاڑی چھوٹنے کا وقت قریب اور انتظار کا موقع نہ تھا۔ ناچار "خدا حافظ" کہتا ہوا بہلی پر آ بیٹھا گاڑی بان نے دم مروڑتے ہوئے بیلوں کو ہنکا دیا۔ وہ پھلواری کے پھاٹک پر کھڑی اس وقت تک نہارتی رہی جب بہلی نظروں سے اوجھل ہو کر اُڑتا ہوا غبار پیچھے نہ لیا۔

دنیا کو نہ جانے کیسے کیسے انقلابوں سے گزرنا پڑا۔ میں تحصیل علم سے فارغ ہو کر کشمکش حیات کا شکار بنا۔ بے انتہا مصروفیت نے کنول کی یاد بھی دھندلی کر دی اور بزرگوں نے شادی کی طلائی بیڑی بھی پاؤں میں ڈال دی اور مجھے حالات کی بھول بھلیاں گم ہو کر سب کچھ محو کر دینا پڑا۔

کافی عرصہ کے بعد حسن اتفاق دوبارہ محسن پور کی فضا میں کھینچ لایا۔ میرے ہمراہ عروس بھی رفیق سفر کی حیثیت سے

آئی تھی۔ خلیل بھائی نے میری خلوت پسندی کی رعایت کرتے ہوئے مکان کا وہی حصہ ہمارے قیام کے واسطے منتخب کیا جہاں اب سے پہلے نشاط آفریں ایام بسر کر چکا تھا۔

یہاں مقیم ہوئے دوسرا روز تھا۔ شام کا جھٹ پٹا پھیلنے والا تھا۔ فضا کی سہانی کیفیتیں ویسی ہی سرور بیز تھیں جیسے سالہا سال پہلے محسوس ہوئی تھیں۔ کچھ کمی تھی تو اُن طرب افزا قہقہوں کی کمی تھی جو صبح سے شام تک چمن میں گونجا کرتے تھے۔ میں باغ کی جانب کھلنے والے حجرے کے قریب بیٹھا کنول کے بارے میں غور کر رہا تھا۔ نہ جانے وہ ہنوز باغ میں کام کرتی ہے یا وداع ہو کر سسرال چلی گئی؟ ناگہاں لطیف قہقہے کے ساتھ کنول حجرے کے سامنے آ کھڑی ہوئی! وہ کافی دبلی ہو چکی تھی لیکن حسن کی رنگین شعاعیں اب بھی اس سے خارج ہو ہو کر فضا میں رنگ آمیزی کر رہی تھیں۔ مجھے اُس کی آنکھوں کی سیاہ پتلیاں کسی جذبہ کے ماتحت ناچتی ہوئی نظر آئیں اُس نے حیرت و مسرت کی مخلوط کیفیت ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ "ارے، آپ کب آ گئے؟"

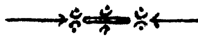
میں جواب دینے ہی والا تھا کہ زہرہ جمال وہاں آ کر میرے برابر کھڑی ہو گئی۔ کنول اُسے دیکھتے ہی تاڑ گئی۔ اُس کی آنکھوں کی چمک مفقود ہو گئی۔ یوں؟ ——— جیسے باد مخالف کے جھونکے سے شمع گل ہو جائے!

اُس نے دیہاتی تہذیب کے مطابق زہرہ جمال کو سلام کیا۔ مسکرائی اور اپنے کاموں میں مشغول ہو گئی ——— دراصل وہ تبسم نہ تھا۔ ایسی آتش خاموش تھی جس کی سوزش اب تک قلب کی پہنائیوں میں محسوس ہوتی ہے۔

مرزا فدا علی خنجرؔ
بی غلام حسین لکھنؤ

چار دن کی چاندنی

(شاعر اعظم حضرت آرزو لکھنوی)



وہ ادا ہائے جو بے صبر بنا دیتی ہے
ٹھہرے پانی میں بھی طوفان مچا دیتی ہے

زندگی عشق کی بن جاتی ہی بجتا ہوا ساز
تار بن بن کے ہر اک سانس صدا دیتی ہی

ترسی آنکھوں کی للک دل سے نہ مٹنے والی
نیند آئی ہوئی آنکھوں سے اڑا دیتی ہی

چپ بھی رہنے سے نہیں راز محبت چھپتا
ہر نظر دل کی لگاوٹ کا پتا دیتی ہی

ایک کو چھانٹ لیا کرتی ہی یہ دل کی پسند
اور ہزاروں کو نگاہوں سے گرا دیتی ہی

اک بدلتی ہوئی دنیا کی طرح دل کی امنگ
غیر کے واسطے اپنوں کو چھڑا دیتی ہی

ہر نفس ولولۂ عشق کی بڑھتی طاقت
راستا روکنے والوں کو ہٹا دیتی ہی

کشش شوق برابر کے جو پاتی ہے گھر
ایک ہی رشتے میں دونوں کو پھنسا دیتی ہی

پھر وہ کیا شے ہی کہ جو دشمن راحت بن کر
خاک میں بڑھتی امنگوں کو ملا دیتی ہی

کرتی ہی عطر سے خوشبو کو جدا بن کے ہوا
رنگ مہندی کا بھی ہاتھوں سے چھڑا دیتی ہی

آرزو وہ بھی دن آتا ہے کہ مجبوری دل
آپ آرام کو تکلیف بنا دیتی ہے

شکاری

(سبزواری کے قلم سے)

چمیلی کے باپ نے کھویا پٹّی کا دونا دیتے ہوئے بیٹی سے کہا آج تو میلے میں بڑی پکار مچ گئی جب ایک لڑکی مجمع کے ریلے سے موتی جھیل کے گہرے پانی میں گر گئی۔

چمیلی۔ تو پھر بیچاری ڈوب گئی ہوگی۔

باپ۔ ہاں ڈوبنے میں کیا رہ گیا تھا بڑے بڑے پیراک کھڑے تھے مگر کنڈھ میں جانے کا ہواؤ نہ پڑا۔

چمیلی۔ پھر

باپ۔ ابھی لکھنؤ میں اللہ والے لوگ زندہ ہیں ایک نوجوان لڑکا دھم سے کودا اور اس کو نکال لایا۔

چمیلی۔ تو بچ گئی۔

باپ۔ اب کیا معلوم نکلی تو بے ہوش تھی وہی لڑکا اسپتال لے گیا۔

چمیلی۔ اُس ڈوبنے والی کے ماں باپ بھائی بھی نہ تھے۔ باپ ہوں گے کیوں نہیں ان کا ستیاناس جائے جوان لڑکیوں کو میلے ٹھیلے میں لئے لئے یہی پھرتے ہیں اور پھر بھول بھی جاتے ہیں۔

چمیلی عیش باغ کی موڑ پر اپنے چھوٹے سے چھپر والے گھر میں رہتی تھی وہ خوبصورت بھی تھی اور اُس نے اس دیہاتی زندگی میں وقت بچا کر اُردو کی چھوٹی چھوٹی کتابیں بھی پڑھ لی تھیں۔

وہ خود تھی اور ماں باپ بس یہی سارا کنبہ تھا فتح گنج کی ایک لڑکی اُس کی دل پسند ہجولی تھی اُس کو تارا کہتے تھے مگر وہ آٹھویں دن سے پہلے نہ آتی تھی جس دن تارا آجاتی اُس دن چمیلی کے یہاں عید ہوجاتی چمیلی عام ملنسار لڑکی نہ تھی بلکہ وہ اپنے محلے میں آدم بیزار کہی جاتی تھی اگر کسی شادی بیاہ میں ماں باپ کے ساتھ جاتی تو خاموش اور الگ تھلگ بیٹھتی صرف سوالوں کا جواب دیتی خود بہت کم گفتگو کا آغاز کرتی۔

مگر محلے ہی میں نہیں دور دور تک چمیلی کی شہرت تھی جب کوئی ماں اپنی لڑکی پر خفا ہوتی تو یہ ضرور کہتی کہ ایک چمیلی بھی تو ہے کام کاجی' ماں باپ کی عاشق' تمیز دار۔

جب گورودوارے میں گروجی شور مچانے والے لڑکوں اور لڑکیوں کو پیٹتے تو یہ طعنہ ضرور دیتے کہ

چمیلی بھی تو لڑکی ہے جس کی آواز تک سُنائی نہیں دیتی چمیلی اپنے گھر میں ان پڑھ لڑکیوں کو کتابوں کی تصویریں دکھانے کے بہانے حرف شناس بناتی اُن کو خود الف اور بے تباتی اور بعد کو انجان بن کر پوچھتی کہ میں بھول گئی اس حرف کا کیا نام ہے لقمان نے خوب جواب دیا جب اُس سے پوچھا گیا کہ ادب از کہ اموختی گفت از بے ادبان۔

چمیلی خوبصورت بھی تھی نہ ایسی جیسے نورجہاں وممتاز محل وہ جمشید کا جام نہ تھی جس کو کوئی پا نہ سکے وہ مراد آباد کا قلعی دار خوبصورت گلاس تھی جس کے دیکھنے سے پانی پینے کو بے اختیار دل بھی چاہنے لگتا ہے اور آنکھوں میں تراوٹ بھی آجاتی ہے۔

آنکھیں لمبوتری سڈول اور زیادہ تر پلکوں کی آڑ میں رہتی تھیں اُن میں صیادانہ طراری نہ تھی غزالانہ معصومیت نمایاں تھی دونوں رخساروں پر بالکل آمنے سامنے دو کالے کالے تل تھے جیسے مشرق سے چاند نکل رہا ہے اور مغرب میں سورج ڈوب رہا ہے وہ بہت کم مسکراتی تھی مگر جب اُس کے گلابی ہونٹوں پر شگفتگی نمایاں ہوتی تھی تو معلوم ہوتا تھا کہ برگ گل پر رنگین تتلی اپنے پروں کو آہستہ آہستہ کھول رہی ہے۔

تارا طرار تھی وہ انہیں ہونٹوں کو چٹکی سے پکڑ کر مسل دیتی تھی اور اکثر یہ بھی کہہ دیا کرتی تھی کہ جب کوئی اور ان ہونٹوں سے دل ٹھنڈا کرے تو میری اس چٹکی کو ضرور یاد کر لینا۔

چمیلی نے ہزار بار تو تارا کو بیغیرت بے حیا کہا مگر فطرت تھوڑی بدلتی ہے۔ آج تارا نے ذرا چمک کر کہا اے چمیلی میں تو چلی تو اپنے نصیبوں کو جھینکا کر۔

چمیلی نے یوں نظریں اونچی کیں جیسے مرجھائی ہوئی چھوئی موئی آہستہ کھلتی ہے اور آہستہ بولی کیا بات ٹھہر گئی۔

تارا ابّا امّاں کا راضی ہونا ہی تو باقی ہے۔

چمیلی حیرت سے پھر نسبت کس نے ٹھہرائی۔

تارا قہقہہ لگا کر میں نے خود اجی جب دو دل ہوں گے راضی تو کیا کرے گا قاضی۔

چمیلی تیری ڈھٹائی سے اللہ بچائے آخر وہ کون ہے۔

تارا۔ سچ تو یہ ہے کہ میں اُس کو زیادہ نہیں جانتی ایک دن میں گرودوارے سے نکل کر گھر آرہی تھی کہ ایک فٹن گاڑی بالکل میرے سر پر پہنچ گئی یوں سمجھو کہ گھوڑے کا سُم میرے سر پر پڑنے ہی والا تھا کہ یہ راہ گیر خدا جانے کس طرح

بجلی بن کر چمکا اور مجھے گود میں لیکر گاڑی کی زد سے باہر آگیا ہنس کر چمیلی تم کو کبھی کسی نوجوان نے تنگ بغل میں لیا ہے میری جان کی قسم سچ کہنا۔

چمیلی ۔ دیکھ تارا تجھے معلوم ہو مجھے ایسی باتیں نہیں بھاتیں .... اچھا کہہ

تارا ۔ وہ بڑا شریف بڑا نیک ہے میں نے شکریہ ادا کیا تو وہ کھسیانا سا ہو گیا۔ میں نے اُس سے کہا کہ باواجی کے پاس ضرور آئے۔

آخر وہ ایک روز آیا باواجی نے اُس کو بہت پسند کیا پھر آنے جانے لگا میرے پاس کچھ دیر وہ بیٹھتا ضرور تھا مگر (قہقہہ لگا کر) پھر تو بُرا مانے گی محبت میں نے ہی سکھائی وہ تو جانتا ہی نہ تھا۔

چمیلی ۔ تیکھی نگاہ سے کاش تارا تو مر گئی ہوتی۔

تارا ۔ لے میں جاتی ہوں اب آٹھویں دن نہ آؤں تو فکر نہ کرنا مجھے اُسی کا انتظار رہتا ہے۔ بہادر کا بہادر کا ۔ یہی اُس کا نام ہے۔

ساون بھادوں میں عیش باغ کے وہ میلے ہوا کرتے تھے جن کو شریفوں کا میلا کہتے تھے جمعہ اور ہفتہ دو دن ان میلوں کے تھے آج جمعہ تھا چمیلی کے گھر کے سامنے میلا ہوتا تھا ۔ چمیلی دور ہی سے تماشہ دیکھتی تھی وہ میلے ٹھیلے میں جانے کی شوقین نہ تھی۔

وہ گھر کے سامنے بیٹھی گائے کے لیئے چارہ تیار کر رہی تھی کہ سامنے سے دو شکاری گزرتے دکھائی دیئے دونوں کے کاندھوں پر بندوقیں اور گلوں میں تھیلے تھے اُن دونوں کی نگاہ بھی چمیلی پر پڑی ایک تو راستہ چلتا رہا اور پیپل کے درخت کی آڑ میں آگیا دوسرا چلتے چلتے ٹھٹھکا گویا بڑے بڑے موزوں پر کانٹا چبھ گیا۔ چمیلی نے اُس کو دیکھا وہ چمیلی کو دیکھ رہا تھا چمیلی نے نظر جھکا لی اور پھر دیکھا شکاری پھر دیکھ رہا تھا ۔ چمیلی اس گستاخی کو برداشت نہ کر سکتی تھی وہ اُٹھکر گھر میں چلی گئی اور دیر تک نہ نکلی ۔ سہ پہر کا وقت تھا عیش باغ کی سڑک میلے والوں سے لبریز اور فضا چرخ پوجوں گانوں سے چھلک رہی تھی کہ کسی نے چمیلی کے دروازے پر دستک دی۔

چمیلی ماں باپ کے کھیت پر جانے کے بعد گھر میں اکیلی رہتی تھی اس لیئے اُس نے نکل کر دیکھا وہی شکاری تھا اور چھاگل گلے سے اُتارے پانی کا طالب تھا مگر اُس کی آنکھیں یوں جھکی ہوئی تھیں گویا [illegible] چاہ بابل میں زہرہ کی پرچھائیں دیکھ رہے ہیں یا چند

گھنٹوں میں اُس نے تہذیب اور فطرت شناسی کے مدرسہ کو فتح کر لیا ہے۔

چمیلی نے دروازہ بھیڑ کر پانی کا کوراگھڑا باہر رکھ دیا۔

تنکاری نے چھاگل میں پانی بھر لیا اور آنکھیں اُٹھائے بغیر اُس نے کہا آپ کا شکریہ میں بہت پیاسا تھا برسات کی دھوپ بڑی تیز ہوتی ہے۔

چمیلی نے یہ الفاظ سُنے اور وہ سوچتی رہی کہ جواب نہ دینا بدتمیزی اور جواب دینا بے شرمی ہے مگر اُس کی شرم جیت گئی۔ کیونکہ جب اُس نے سر اُٹھایا تو تنکاری جا چکا تھا۔

چمیلی علی الصباح میٹھا پانی بھرنے کے لئے کنوئیں پر جاتی تھی جب تاروں کے سوا اُس کو دیکھنے والا دور دور نہ ہوتا تھا وہ کمر پر خالی گھڑا رکھے نیند بھری آنکھوں اور مست قدموں کے ساتھ جا رہی تھی کہ اُس کے پاؤں کے نیچے کوئی چیز دبتی محسوس ہوئی اُس نے رُک کر دیکھا اور جھک کر اُٹھا لیا یہ ایک سفید رومال تھا رومال اُٹھاتے ہی اُس کو ایک خوشبو سی محسوس ہوئی اُس نے بے ارادہ سونگھا اور جلدی سے رومال کو ہونٹوں کے قریب سے ہٹا لیا کیونکہ خوشبو کی چوری طبیعت سہی پھر بھی چوری ہے۔

ہائے کسی راہگیر کا رومال ہے گر پڑا ہوگا اُس نے کہا اور پیپل کی شاخ میں ایک گرہ دیکر باندھ دیا جس کا ہوگا لے جائے گا۔

جمعہ سے زیادہ ہفتہ کو عیش باغ کے میلے میں جماؤ ہوتا تھا آج ہفتہ ہی تھا عین چمیلی کے گھر کے سامنے تنکاری جھول رہا تھا مگر وہ چمیلی کی طرف مخاطب بھی نہ تھا اس لئے چمیلی بھی بے فکری سے اپنے کاموں میں مشغول تھی کبھی گھر میں چلی گئی کبھی باہر آ گئی۔

میلہ ٹوٹنے کا وقت آ گیا کیونکہ سورج ڈوبتے ہی میلے کا چراغ گل ہو جایا کرتا تھا کسی نے پھر چمیلی کے دروازے پر دستک دی چمیلی نے دیکھا وہی تنکاری تھا مگر اُس کی آنکھیں زمین کی ساخت دیکھ رہی تھیں۔

چمیلی گھر سے نکلی اور ٹھٹھک گئی آپ تو تنکاری ہیں۔

جی ہاں اُس نے مسکراہٹ سے احتیاط کرتے ہوئے کہا میں یوں حاضر ہوا کہ یہ رومال میرا ہے شاید شاید اُس دن یہیں گر گیا تھا اکثر چیزیں راستے میں گر جاتی ہیں۔

چمیلی۔ تو آپ اپنا رومال لے لیں۔

تنکاری جی ہاں یہ آپ کی کتاب شاید آپ سے گر گئی تھی کیونکہ ابھی راستے میں پڑی ملی۔

چمیلی میری کوئی کتاب نہیں گری۔

تسکاری۔ تو شاید آپ کی کسی ہمجولی کی ہے اس نے کہا

چمیلی کتابوں کی عاشق تھی اُس نے کتاب لے لی اس کتاب کا نام "دولھن کی راتیں" تھا اُس نے اُلٹ پلٹ کر پہچاننے کی کوشش کی اور جب یہ طے ہوا کہ کتاب اُس کی کسی ہمجولی کی بھی نہیں ہوسکتی۔ تو تسکاری واپس جاچکا تھا۔

چمیلی نے صبح کا انتظار نہیں کیا۔ رات بھر کڑوے تیل کا دیا اُس کا منھ، اور وہ اُس کی روشنی میں کتاب دیکھتی آج اُس کو جنسیت کے وہ راز معلوم ہوئے جو اس سے پہلے معلوم نہ تھے۔

وہ دن چڑھے جاگی اور آج اُس نے دیر تک آئینہ دیکھا اُس نے گالوں کی سنہری جلد کو جس میں لال لال ٹوٹیاں سی گوٹ لگی تھی بار بار دیکھا۔ اُس نے بالوں کا جوڑ کبھی گورے گورے چہرے اور کبھی بھرے بھرے شانوں سے ملا یا اس ہلچل میں ہاں شاید اسی ہلچل میں کئی بار گرتے ہوئے دوپٹہ کو بھی سنبھالنا پڑا۔ اُس کو تارا یاد آئی۔ اور یہ بھی یاد آیا کہ کاش تسکاری آجاتا۔

ممکن ہے کتاب واپس کرنے کی جلدی ہو۔

بدھ، جمعرات، جمعہ، گزر گیا ہفتہ کی دوپہر، سہ پہر بھی نہ رہی میلا بڑھنے لگا تسکاری نہ آیا جب چمیلی اور اُس کے ماں باپ سونے کا ارادہ کر رہے تھے

کسی نے دروازے پر دستک دی چمیلی جلدی سے دروازے پر آگئی۔

ہاں دستک دینے والا تسکاری ہی تھا یکا یک تسکاری وہ تھکا ماندا سا زمین پر بیٹھا تھا اُس کے سامنے کچھ کبوتروں کے پاؤں بندھے ہوئے پڑے تھے جن کے پاس بندوق اور سامان کا خاکی تھیلا رکھا ہوا تھا وہ خود زمین کو دیکھ رہا تھا شاید یہ معلوم کرنے کے لئے کہ پانی زمین پر ہے یا زمین پانی پر قائم ہو۔ آج چمیلی نے ابتدا کی۔

آپ ہیں بہت رات گئے آئے مجھے انتظار تھا.....

آخر کتاب کب تک واپس نہ لیجئے گا۔

تسکاری۔ کیا پسند نہیں آئی۔

چمیلی۔ کتاب تو اچھی ہے مگر پرائی ہے نا

تسکاری بہت مختصر سا سر کو اُٹھا کر یہ کتاب کس مضمون پر لکھی گئی ہو۔

چمیلی مسکرادی اور چلی گئی۔

واپس آکر اُس نے کہا لیجئے اپنی کتاب۔

تسکاری۔ اور ایک مرتبہ پڑھ لیجئے ابھی مالک تو ملا ہی نہیں ہے۔

چمیلی۔ میں کئی بار پڑھ چکی اب آپ پڑھیئے گا۔

تسکاری۔ کتاب کی طرف ہاتھ بڑھاتے بڑھاتے

آہ ہاتھوں سے پاؤں پکڑ کر۔

چمیلی۔ کیوں کیوں۔

تنکاری۔ آج کا دن بڑی مصیبت کا دن تھا دن بھر شکار نہ ملا جھٹپٹے وقت صرف یہ چار کبوتر ہاتھ آئے اندھیرے میں راستہ بھولا ساہی نے کانٹا مار دیا پنڈلی زخمی ہوگئی اور پھر دن بھر کھانا بھی ہاتھ نہ آیا۔

چمیلی نے جھک کر پنڈلی کا زخم دیکھا اس کا چہرہ تنکاری کے چہرے سے اتنا قریب تھا کہ جب اُس نے ہائے کہکر پاؤں تھاما تو دونوں کے رخسار آپس میں لڑ گئے۔

دھندلی چاندنی میں چہروں کے رنگ کا تغیر معلوم نہ ہوا۔

مگر چمیلی نے کہا پھر جراح تو اس وقت نہ ملے گا۔

تنکاری گرم پانی سے دھو لینا کافی ہے اور...

چمیلی۔ گردن جھکا کر کھانا تو آج بچا ہی نہیں ہم غریب آدمی ہیں۔

تنکاری۔ نہیں نہیں خدا کا دیا سب کچھ ہیں موجود ہے فقط تھوڑی سی آگ تنکاری کو باورچی ہونا لازم ہے۔

کبوتر کے کباب۔ ذرا آپ بھی چکھیئے گا ہنڈکلیا۔

چمیلی ہنس دی اور رات کو دونوں کباب پکاتے اور کھاتے رہے۔

صبح چمیلی کو تارا یاد آئی تارا نے اُس کو اپنا قصہ سُنایا تھا آج چمیلی اپنی کہانی سُنانا چاہتی تھی۔

وہ ماں سے اجازت لینے بڑھی تھی کہ تارا کی ماں آنسو بہاتی پہنچی اور چمیلی کی ماں کے گلے مل کر رونے لگی۔

ارے کیا ہوا کیا ہوا تارا کیسی ہے۔

چمیلی کی ماں نے کہا

تارا کی ماں۔ تارا اب کہاں۔ آج آٹھ دن ہوئے پڑھنے گئی تھی پھر نہ آئی۔ لوگ کہتے ہیں پردیسی فقیر آئے ہوئے ہیں وہ بچوں کو پکڑ لے جاتے ہیں۔

چمیلی کو معلوم تھا کہ اُس کو کونسا فقیر لے گیا ہوگا۔

آگ لگی آگ لگی عیش باغ کی سڑک کے نزدیک شور تھا۔ چمیلی کا گھر جل رہا تھا لوگ پانی اوچھال رہے تھے اتنے میں تنکاری آگ میں کودا اور چمیلی کو نکال لایا غنیمت ہوا اُس کے نکلتے ہی جلتا ہوا چھپر گر پڑا۔ چمیلی کے ماں باپ اور اُن کی ساری گرستی جل کر راکھ ہو چکی تھی۔

آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا۔

لوگ حیران تھے جاڑوں کی رات میں آگ

اور پھر ایسی لگی کہ بچانے کا کوئی راستہ ہی نہ چھوڑا ایک پڑوسی نے کہا کسی دشمن کا کام تھا یہ آگ لگی نہیں لگائی گئی تھی۔

دوسرے نے تنکاری کی بہادری کی تعریف کی۔

تیسرے نے تنکاری کو نزدیک سے دیکھ کر کہا یہ تو وہی بہادر ہے جس نے موتی جھیل سے ڈوبتی کنیا نکالی تھی بڑا بہادر لڑکا ہے۔ واہ جی واہ۔

تنکاری چمیلی کو کاندھے پر لئے اسپتال جا رہا تھا وہ دھوئیں اور گرمی سے بے ہوش تھی۔

چمیلی کو آٹھویں روز اسپتال سے اجازت ملی وہ اپنے گھر اور اپنے ماں باپ کے حال سے ناواقف تھی اُس کو گھر میں آگ لگنا اور جلتے گھر سے نکلنے کے لئے سب کا دوڑنا یاد تھا اور بس۔

اسپتال کے دروازے پر تنکاری تانگہ لئے موجود تھا چمیلی نے پہلا سوال کیا کہ میرے ماں باپ کا حال معلوم ہے۔

تنکاری نے آنکھوں سے آنکھیں لڑاتے ہوئے کہا سب ٹھیک ہے تانگے پر بیٹھ جایئے۔

چمیلی بیٹھ گئی پردہ دار تانگہ تھا اُس کو نہیں معلوم وہ کس راستے سے کہاں آئی۔

جب وہ تانگہ سے اُتری تو ایک کمرہ میں لائی گئی ایک پیش خدمت کھانا لائی اُس نے کھانے سے انکار کیا۔ مجھے میرے ماں باپ کے پاس پہنچا دو۔

تنکاری۔ ہاں ہاں ابھی ابھی جتنی جلدی کھانے سے فرصت ہو جائے۔

اُس نے جلدی جلدی کھانا کھایا۔

کھانے کے بعد تنکاری نے اُس کو کیا خبر دی کہ وہ بے ہوش ہو گئی۔

یہ کمرہ جس میں چمیلی تھی ایک بڑے محل کا کمرہ تھا دونوں رُخ صحن تھے دو دروازے تھے جو زنانہ و مردانہ دونوں جانب کھل سکتے تھے۔ زنانہ مکان محل تھا ایسے ہی کمرے چاروں طرف ملے جُلے بنے ہوئے تھے بیچ صحن میں بڑا سا حوض تھا۔

چمیلی ماں باپ سے صبر کر چکی تھی ایک روز تنکاری نے اس کے سامنے اچھے سے اچھے کپڑے اور اچھے سے اچھا زیور رکھا اور منت کر کرکے خود اُس کو پہنایا اور اُس کے گلے میں باہیں ڈال کر کہنے لگا۔

کیا تم میری تنہائی پر ترس نہ کھاؤ گی میرا کوئی نہیں ہم تم دونوں ماں باپ بھائی بہن سے محروم ہیں کیا تم میری نہ ہو گی۔

چمبیلی کے پاس کیا جواب تھا وہ سر جھکا کر خاموش ہو گئی۔ چند گھنٹوں کے بعد ہی اُس کو معلوم ہو گیا کہ اس لباس و زیور سے وہ دولھن بنائی گئی تھی اور اب وہ لڑکی نہیں بیاہی ہوئی عورت ہے۔

تیسرے دن دولھن بننے کے تیسرے ہی دن وہ مسرور تھی اور چھپر کھٹ پر پڑی شنکاری کا انتظار کر رہی تھی وہ نہ آیا دس بجے گیارہ بجے دو اپر ہو گئے وہ کمرے میں ٹہلنے لگی۔ شنکاری اب بھی نہ آیا زنانہ مکان کی طرف دروازے کی درازسے دھوپ اندر آ رہی تھی اُس نے دروازہ کھول دیا۔

اُوہو اُدھر تو بڑا سا محل ہے چمبیلی نے دل سے کہا اور سامنے کے کمرے میں کون......

ہائیں تارا تارا ارے تارا۔

تارا نے پلٹ کر دیکھا ارے چمبیلی بہن تو کہاں۔

یہاں میری شادی ہوئی ہے۔ چمبیلی نے کہا۔

تارا۔ تمہیں تین دن پہلے اس کمرے میں لائی گئی ہو۔

چمبیلی۔ ہاں

تارا۔ غضب ہوا۔

چمبیلی نے آنکھیں پھاڑ کر کہا کیوں

اتنے میں دوسرے دو کمروں سے دو لڑکیاں اور نکل آئیں۔

تارا۔ کیسی شادی کیسا بیاہ میں تیسری اور تم چوتھی داشتہ ہو۔

ان لڑکیوں کی طرف اشارہ کرکے یہ پہلی ہے وہ دوسری۔

چمبیلی نے لرزتے ہوئے کہا سچ سچ وہ شنکاری ہے۔

یہ دونوں کیونکر آئیں تارا

چمبیلی نے رک رک کر کہا

تارا۔ اس کو موتی جھیل سے نکالا تھا اور اس کو

میلے میں راستہ بھول گئی تھی راستہ بتایا تھا۔

چمبیلی بے ہوش ہو گئی۔

"محرابِ قوسِ قزح"

ساون کی نشیلی راتیں ہیں، تاریکی ہی، تنہائی ہی
پھر میرے لیے بعدِ مدت ایک ایسی ساعت آئی ہی
تو یہ نہ سمجھ ہم محفل میں تیری چپ بیٹھے رہتے ہیں
کل ہم نے نمازِ عشق پڑھی زلفوں کے سنہری سائے میں
اندازِ جنوں ہی اچھے ہیں اب دامِ خرد میں کون پھنسے
فرزانگیٔ ہر دو عالم قربان ہی اُس کے اشارے پر
اے ذوقِ طلب اس کو ڈھونڈھیں جو دل میں رہ کر دل ہی نگر
اے دوست نہ ہو حیران، اگر لوٹ آیا ہی ماضی میرا
برسات بجائے خود رنگیں، اور میرا دل ہی رنگیں تر
کچھ ہلکے ہلکے شعلوں سی پھر بھڑکنے لگے ہیں قلب و جگر
محرابِ قوسِ قزح کیا ہی، پہچان اسے دھوکے میں نہ آ
بجلی کے شرارے کچھ بھی نہیں، ہاں دل کے شرارے سب کچھ ہیں

اللہ! - یہ کیسے عالم میں ایک کافر کی یاد آئی ہی
جو اپنی جلو میں بے پردہ دوشیزہ جلوے لائی ہی
ہم جیسے حسن پرستوں کی خاموشی بھی گویائی ہی
سجدوں کی لطافت پوچھ نہ کچھ اک اَن مٹ لذت پائی ہی
ہم عشق کے بندوں کی نادانی ہی عینِ دانائی ہی
جو تیری نظر میں وحشی ہی دیوانہ ہی، سودائی ہی
انسان کی تمنا کون کرے، انسان تو خود ہرجائی ہی
میں نے اپنے ہم جنسوں سے کچھ بہتر قسمت پائی ہی
ہم دونوں ہی کے تصرف سے دنیا پہ مستی چھائی ہی
ممنون ہوں میں اس کا جس نے جذبات میں آگ لگائی ہی
یہ عشق کی موجِ رنگیں ہی، یہ حسن کی اک انگڑائی ہی
دنیا کو بتایا ہی مضطر جب دل سے آگ اُڑائی ہی

مضطر تو پریم پجاری ہی اور وصل و ہجر سے بے پروا
لیکن اک شوخ کو دھوکا ہی وہ میرا ہی شیدائی ہی

(مضطر صدیقی)

نہاری سے کلیجے

(عربی آرٹ سے)

(شمس یاسر نقوی)

ہونے والے سمدھی کی دعوت سیٹھ یونس سے کنجوس کے لیے بھی آخر ضروری ہوگئی۔ ہاں وہ جتنا خرچ بچا سکتا تھا اس نے بچا لیا یعنی نہ چائے، نہ ڈنر ناشتہ بھی علی الصباح تاروں کی چھاؤں میں کیونکہ نہاری سورج کا منہ نہیں دیکھتی اور صبح کی ہوا اور کلیجوں میں پیدائشی بیر ہے۔

آخر میں خان عبداللہ کو آج ایک ہم پیشہ کونسل کے ممبر کے یہاں ڈنر پر جانا تھا مگر سیٹھ یونس کی بیٹی سے نور چشم کی نسبت بھی رکھنا ضروری تھی اس لیے انھوں نے رات کو کھانا نہ کھایا عذر کر کے چلے آئے کیونکہ تاروں کی چھاؤں میں کھانا کھانے کی عادت بھی نہ تھی اور بدہضمی کا ڈر بھی۔

خان عبداللہ کو نوکر نے تڑکے تڑکے جگا بھی دیا اور ٹیکسی پر بیٹھ کر پہنچ بھی گئے کیونکہ سیٹھ یونس دہلی کا مشہور تھوک فروش تھا اور اس کی نئی کوٹھی تو بچے بچے کو معلوم تھی۔

سیٹھ یونس سمدھی کی خبر پاتے ہی آنکھیں ملتا کوٹھی کے باغیچے کو پھلاندتا دروازے پر پہنچا ایک طرف اس نے سمدھی کا استقبال کیا۔ دوسری طرف حسرت بھرے اشاروں سے نوکر کو کچھ حکم دیا۔

سیٹھ یونس ان محتاط لوگوں میں تھا جو مہمان کے آجانے کے بعد کھانے کا سامان کرتے ہیں۔

سیٹھ یونس کی کوٹھی کی سب ہی تعریف کرتے ہیں وہ اپنے سمدھی سے بھی امیدوار تھا۔ مگر خان عبداللہ اپنے سگار کو دانتوں اور ہونٹوں سے حرکت دیتے ہوئے بڑھنے لگے تو سیٹھ یونس کو رکنا پڑا۔ خان عبداللہ حصاری دیواری کے قریب پہنچ کر جب رکے تو ٹیکسی اپنی ڈیوٹی پوری کر کے روانہ ہو رہی تھی۔

سیٹھ یونس نے اپنی کوٹھی کے عالی شان دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

آپ نے یہ دروازہ دیکھا؟ یہ لکڑی ہندوستان میں تو نایاب ہی ہے بلکہ یورپ میں بھی کم دستیاب ہوتی ہے اس کو آبنوس کہتے ہیں یہ اسپین میں پیدا ہوتی ہے۔ اور اسپین کے بندرگاہ اشبیلیہ سے دوسرے ممالک کو روانہ ہوتی ہے۔ فی مربع انچ قیمت پہلے ہی دھڑی جاتی ہے اس میں جہاز، ریل اور پھر گھر تک لانے والی ٹھیل

چنگی لینے والے افسر کی رشوت شامل نہیں ہے۔ ریلوے
قلی اور گوڈس کلرک کے انعام سے بھی مطلب نہیں
آپ غور کریں کہ جس زمانے میں نہ جہاز تھے نہ ریلیں
اس وقت یہ لکڑی ہندستان میں کیونکر آئی ہوگی۔
یہ وہ زمانہ تھا جب تعمیر سومناتھ کی تجویز زیر
غور تھی۔ میں بات مختصر کرکے عرض کرتا ہوں کہ غالباً یہ کیکر والی
ساحل بلاول جو آج بھی نواب صاحب جوناگڑھ کی
ریاست میں ہے جہاں چھوٹے چھوٹے بیچے موتی بھی پائے
جاتے ہیں۔ اتاری گئی ہوگی۔

میں کہتا ہوں جس وقت نہ ہندستان میں مغل آرٹ
آیا تھا نہ سادات کی تہذیب بھلا ولندیزی اور انگریزوں
کا تو ذکر ہی کیا اس وقت بسولہ، آری، رکھانی کیا کیا
نجاری کے اوزار موجود تھے جن سے یہ دروازہ تیار
ہوا ہوگا خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا

خان عبداللہ نے گھڑی نکال کر دیکھی۔

یونس گھڑی کا دیکھنا بیکار ہے اپنے وقت پر آپ باہر
خبر ہو جاتی ہے اسی کا نام تو قدرت ہے اور قدرت سے
کون مسلمان انکار کر سکتا ہے۔ معاذ اللہ۔

نہاری کیلئے بات کی بات میں تیار ہوتے ہیں گیہوں
کی آڑھت تو یہ سامنے ہی کا ہے، آٹا پیسنے کی مشین سبیل پر
کے پشت پر یہی ہوٹل جس میں آپ کا قیام ہے نہاری پکانے والا

جامع مسجد کے نیچے اور کلیجہ پز دریا آباد کے ذرا آگے آپ کو
تو اس تاریخی واقعہ کی طرف متوجہ ہونا چاہیے آپ کا وقت
عزیز ضائع کرنا مقصود نہیں ہے۔ سومناتھ کا واقعہ
تعمیر بڑا دلچسپ ہے۔

اس شہر میں مشہور مندر کے علاوہ ڈھائی ہزار پجاریوں
اور ڈیڑھ ہزار نائیوں اور ایک ہزار نوبت بجانے والوں
کے مکان تھے۔ اس تاریخی نوٹ سے آبادی کا اندازہ کیا
جاسکتا ہے اگر ایک نائی فی گھنٹہ آٹھ آدمیوں کے سر
مونڈتا ہوگا جو کوئی بڑی بات نہیں تو آپ سوچیں کہ
دن میں کتنوں کے سر مونڈتے ہوں گے۔ افسوس کہ
ریاضی میں مجھے دخل نہیں ہے۔

خان عبداللہ نے سگار پھینکتے ہوئے حصار کی دیوار
سے ٹیک لگائی اور کہنے لگے کہ آپ کو تاریخ میں کافی
معلومات حاصل ہیں۔

یونس۔ خیر یہ تو آپ کی قدر دانی ہے۔ یہ یاد رہے کہ
میں صرف اس دروازے پر گفتگو کر رہا ہوں اور اختصار مد نظر
رکھتے ہوئے جو سونا چاندی اس میں استعمال ہوا ہے اس کا ذکر چھوڑتا
جاتا ہوں۔

سومناتھ مندر مقناطیس سے بنایا گیا تھا اور اس میں
جو بت تھا وہ لوہے کا تھا۔ بس سادی کشش نے اس بت
کو معلق کر دیا تھا۔ پھر لطف یہ کہ اس بت کے ایک ہاتھ میں

ایک باریک تار لگا دیا گیا تھا جس کا راز سب سے بڑا پجاری ہی جانتا تھا۔ جب کوئی مال دار آرزومند آتا تھا اور دعائیں مانگتا تھا مثلاً بیٹا دے۔ بیٹی کا بیاہ کر دے۔ کہیں کا راج دے تو پجاری اس تار کو حرکت دیتا تھا اور بت کا ہاتھ بلند ہو جاتا تھا جو قبول مراد کی علامت تھا۔ پھر نذرانوں کا کیا کہنا اور کیا پوچھنا

خان عبداللہ کے سر پر دو ہو بچے اپنی پہلی کرن ڈالی تو یہ دروازہ سومنات سے آیا۔ خان عبداللہ نے کہا

یونس گھبرا کر نہیں نہیں ہرگز نہیں ابھی آنے سے کیا واسطہ میں بات کو خود طول دینا نہیں چاہتا۔

الغرض اس مندر کی دھوم شیراز تک پہونچی اور شیخ سعدی علیہ الرحمہ سادھوؤں کے بھیس میں آ کر یہاں برسوں رہے اور انھوں نے بت کے ہاتھ اٹھنے کا راز معلوم کر کے وہ تار کاٹ دیا اور پھر محمود غزنوی کی طرف چلے۔ میں بات کو مختصر کرنے کے لیے راستے کا حال نہیں کہتا

خان عبداللہ کی گردن تک۔ دھوپ آ چکی تھی انھوں نے اکڑوں بیٹھے ہوئے کہا کہ اجازت ہو کر بیٹھ جاؤں۔

یونس۔ جی ہاں جی ہاں دل لگا کر سننے ہی کا یہ لطف ہے

القصہ شیخ علیہ الرحمہ غزنی پہنچے اور سلطان کو حالات سے مطلع کیا اور بس اختصار کو دیکھئے کہ سلطان رنگ زادہ سندھ سے گزر کر بنبر والہ سے ہوتا ہوا کاٹھیاواڑ پہنچا۔

خان عبداللہ۔ اور سومنات توڑ دیا۔

یونس۔ آپ نے بھی غضب کیا۔ صاحبقران اعظم حضرت امیر حمزہ فقط پردہ قاف فتح کرنے گئے تھے بارہ سال بعد پلٹے اور ان کا مشہور نواسہ اسلین کرب غازی طلسم ہوشربا میں افراسیاب سے اٹھارہ برس لڑا کیا سومنات ہوشربا سے کوئی چھوٹی چیز تھا۔

برین عقل و دانش بباید گریست

خان عبداللہ نے گھڑی دیکھی دس بج کر بیس منٹ تھے انھوں نے زیر لب کہا یا اللہ

یونس یا اللہ کا کیا ذکر وہاں تو جناب بے کار سے تھی بے کار سے۔

خان عبداللہ تو سومنات توڑ دیا اور یہ دروازہ وہاں سے آپ کو ملا۔

یونس۔ خدا آپ کو نیکی دے اچھا یوں ہی سہی سومنات توڑ دیا مگر دروازے کا ہاتھ آنا آپ نے کوئی کھیل بنایا ہے صاحب یہ دروازہ یوں ہی پڑا رہا ایک دن دو دن یا ایک سال دو سال نہیں جناب .... عہد غزنوی سے اکبر اعظم کے عہد تک نہ دھوپ نے سکھایا نہ برسات کے پانی نے گلایا نہ دیمک نے کھایا۔

بات میں اختصار مد نظر ہے ورنہ غزنوی سے اکبر تک بادشاہوں کے نام گنوانا ضروری تھے یہ بھی چھپا ہوا

کہ اکبر اعظم کو گجرات پر حملے کی کیا ضرورت ہوئی اس ملک کا نام بھی گجرات نہ تھا۔ سورتھ کہتے تھے کسی بڑے تاریخ داں کو بھی معلوم نہ ہوگا اگرچہ یہاں اسلامی سلطنت موجود تھی مگر اکبر اعظم چڑھ دوڑے یعنی ان کی فوجیں آ پہنچیں

خان عبد اللہ اور دروازہ

یونس ۔ مجھے جلد بازی سی خرچہ ہی جب کہ میں خود اختصار کا کامل لحاظ کر رہا ہوں۔

خان عبد اللہ۔ آپ سے کیا تکلف اب تو کافی بھوک ہی بارہ کا عمل ہو چکا ہی۔

یونس۔ آپ نے دوسری بات چھیڑ دی جو اپنی جگہ طب کا ایک اہم مسئلہ ہی۔ اگر آپ کی صحبت کا معاملہ نہ ہوتا تو میں جواب ٹال جاتا۔

لیجئے اب کیا بات رہی وہ نوکر ہماری کلیجے کی تیاری کی خبر لا رہا ہی کہ آپ کی صورت کہہ رہی ہی۔ مگر ابھی دسترخوان نہیں بچھے گا۔

ناکافی بھوک پر کھانا زہر کے برابر ہی میں خدانخواستہ کچھ آپ کا دشمن ہوں۔

دیوجانس کلبی سے آپ واقف نہ ہوں گے یہ عرب کا مشہور حکیم تھا۔ اس کا قول ہی کہ جب تک بھوک سے معدہ میں تشنج نہ پیدا ہو کھانا کھانا خودکشی ہی اور حضرت افلاطون الٰہی فرماتے ہیں ان کے نام سے تو دنیا واقف ہے

مگر بطور اختصار یہ ذکر چھوڑتا ہوں کہ آپ کو الٰہی کیوں کہتے تھے ان کا فرمانا ہی کہ جب تک معدہ لپک لپک چھپاتی آنتوں پر منھ نہ ڈالنے لگے اس وقت تک کھانا حرام ہی اور جناب شیخ الرئیس صاحب قانون و شفا کا حکم ہے جب معدہ بھوک سے کلیجے پر چڑھ جائے تب دو ایک نوالے کھانا چاہیئے یہی شیخ الرئیس ہیں جن کا نام بو علی سینا ہی اور شہنائی انھیں کی ایجاد ہی مگر نظر بر اختصار یہ ذکر چھوڑ رہا ہوں اور یقین نہ آئے تو کتاب لا کر دکھا دوں وقت بے وقت کے لیے کتابیں بھی پاس ہی رکھتا ہوں۔

خان عبد اللہ دامن تھام کر کہا آپ کے ہر حرف پر مجھے اعتبار ہی کتاب لانے کی تکلیف نہ فرمائیے۔

مگر اب وہ بجا چاہتے ہیں گھبرا کر اٹھ بیٹھتے ہیں۔

یونس۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ آپ تاریخ کے شیدائیوں میں ہیں بیٹھنا شاق ہو گیا۔ خیر تو سنیئے یہ تو ابھی فقط دروازے کا تذکرہ ہی۔ کوٹھی کی ہر اینٹ اپنے اندر ایک تاریخ رکھتی ہی۔ جتنا جتنا بڑھتے چلے گا۔ بتاتا جاؤں گا۔ اور لطف یہ کہ جو کچھ کہونگا سند میں تاریخ کی کوئی کتاب پیش کر دونگا

ہاں چلئے خیر یوں ہی سہی یہ دروازہ دہلی آ گیا مگر کیا دہلی میں رہ گیا۔ لاحول۔ ہرگز نہیں۔ سو دو حبلی جاٹ ۔ یہ ...... یہ بھرت پور ریاست کا باوا اٹھو کھڑا ہوا اور دہلی سے یہ دروازہ بھرت پور پہنچ گیا

مگر اللہ نے میر نجف علی سا بانکا ترچھا مسلمانوں میں پیدا کیا ہے دو ہزار سوار چار سو پیادے اب جو میر اشیر گرجتا ہے شہر یار راج نہ پاٹ نہ جاٹ۔

میر صاحب نے ریاست کو خالصہ کر لینا چاہا تھا گر رانی نے بھرت پور اور پھپھوند کے سیدوں کے دامن میں پناہ لی انہوں نے سفارش کی تو ریاست بچی۔ مگر میر صاحب اس دروازے کو بھلا کیا چھوڑتے۔

خان عبداللہ۔ ساتھ لے آئے اور آپ کے ہاتھ لگ گیا

یونس بقول۔ آپ کے۔ ساتھ لے آئے مگر ہاتھ لگ جانا کھیل ہے۔

میر صاحب نجف گڑھ نہ جا رہے تھے اس دروازے کو نجف گڑھ میں لگوایا مگر مولا کہیں لوٹ کا مال قبول کرتے ہیں۔ روز صبح کو دروازہ گرا ہوا ملتا تھا۔ آخر میر صاحب نے عاجز ہو کر جامع مسجد کی سیڑھیوں پر ڈلوا دیا۔

خان عبداللہ۔ گھڑی دیکھ کر چار بج رہے چار۔ جھلا کر اب تو آپ کو ملا۔

یونس۔ واہ آپ نے بھی کیا سہل نسخہ تجویز کیا ہے اے جناب غدر ہو بڑا ۵۷ء کا غدر

خان عبداللہ۔ دھوپ کی تپش سے گھبرا گئے تھے انہوں نے کوٹ اتار کر دیوار پر رکھ دیا اور گریبان کا بٹن بھی کھول دیا۔

یونس اور اس دروازے کو کباڑیے اٹھا لے گئے تو بارہ کباڑیوں نے اپنے اپنے حصے الگ کر لیے ان سے میں نے یہ سب حصے لیے ہر کباڑیے کا ایک عجیب قصہ ہے پہلے کا قصہ سنیے۔

خان عبداللہ آسمان کو دیکھ کر زمین پر بیٹھ گئے آخر ایک تدبیر ذہن میں آئی۔

خان عبداللہ۔ سنیے سمدھی صاحب۔ عہد اکبری کی تاریخ تک تو بیان ہے باقی سب غلط معلوم ہوتی ہے۔

یونس۔ میں سند میں کتاب پیش کر سکتا ہوں کوٹھی میں تو چلیے۔

خان عبداللہ۔ کیا دن بھر کی محنت ضائع کر دوں گا دروازے کی تاریخ دروازے ہی پہ لکھی ہو گی لائیے تو کتاب

یونس کتاب لینے لپکا اور خان عبداللہ سر پر پاؤں رکھ کر ہوٹل کی طرف چلے۔ نوکر نے دیکھ کر یونس کو خبر دی میاں میاں سمدھی صاحب خفا ہو گئے بغیر نہاری کلیجے کھائے جا رہے ہیں۔

(یونس ہانپتے ہوئے بھلا یہ بھی کوئی بات ہے یہاں نہیں تو ہوٹل میں نہاری کلیجے کھانا پڑیں گے۔ نہاری کا پتیلہ کلیجیوں کی ٹوکری لے تو آ یونس جھپٹ کر بڑھا خان عبداللہ وہی گلیاں نکلنے پائے تھے کہ یونس نے دیکھ لیا اور اس نے آواز دی سمدھی صاحب یہ خاتمہ اچھا نہیں۔

نہاری کلیجے کھاتے جایئے۔ خان عبد اللہ اور بڑھے یونس نے چھلانگ لگائی۔ بھائی صاحب نہاری ٹھنڈی ہو جائے گی۔ خان عبد اللہ ایک گلی میں گھس گئے یونس نے ہوڑ سی آواز دی۔ صاحب نہاری کلیجے۔ خان عبد اللہ گلی سے سبزی منڈی کی سڑک پر نکلے وہاں چند لڑکے گڑیاں کھیل رہے تھے اُنھوں نے دیکھا۔ ایک صاحب صورت شکل سے شریف بڑے آدمی مگر گریبان کھلا ٹوپی ندارد لکڑی ٹیکتے بھاگے جارہے ہیں دوسرے صاحب آوازیں دیتے جا رہے ہیں نہاری کلیجے لیتے جایئے۔ تیسرے صاحب سر پر بنگچہ رکھے مسکرا رہے ہیں لڑکوں میں سے ایک آگے بڑھا۔ اس نے تالی بجا کر خان عبد اللہ سے کہا۔ نہاری کلیجے کھائے گا۔

خان عبد اللہ کو اس کی درمیانی مداخلت گوارا نہ ہوئی اُنھوں نے رعب جمانے کو کہا۔

بھاگ ..... نہاری کلیجے کے بچے۔

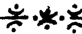
لڑکا سمجھا چوٹ اپنی اصلی جگہ لگی اس نے اپنے ساتھیوں کو دیکھا وہ سب دوڑے۔

نہاری۔ کلیجے کھائے گا۔ نہاری کلیجے کھائے گا۔

خان عبد اللہ نے لکڑی اٹھائی۔

اب تو دوکان داروں اور راہ گیروں نے بھی پکھا اُنھوں نے بھی لڑکوں کا ساتھ دیا۔ نہاری کلیجے لیتا جا نہاری کلیجے لیتا جا

لُوٗ ہی، لُوٗ لُوٗ ہی۔ نہاری کلیجے کھائے گا



واجد علی شاہ کی عید

(شاعر لکھنوی)

ہلال عید لب داستاں سرا بن جا نظر نہ موڑ غریبوں کا آشنا بن جا
جو گم ہی ضعف سے وہ حرف مدعا بن جا فسانۂ شب مسلم کی ابتدا بن جا
حضور غیر میں شکوہ سے گوارا ہے
تو سن کہ ہم ہیں ترے اور تو ہمارا ہے

قدیم خیر طلب ہے رفیق حال ہے تو بنائے ماہ ہے تو اختتام سال ہی تو
جو مسجد نبوی پر تھا وہ ہلال ہے تو اذان کہدے تو اب بھی لب بلال ہی تو
بنا تھا نور کا در مسجد جدید میں تو
شریک تھا مری یثرب کی پہلی عید میں تو

پریدِ عید تھا افطار کا پیام تھا تو نشان تمت نفل سر صیام تھا تو
دمشق و مصر و یمن میں چراغ شام تھا تو جو دست موج پہ دجلہ کی تھا وہ جام تھا تو
کبھی نجف میں کبھی باب کاظمین پہ تھا
سلام عید ہمیشہ در حسین پہ تھا

جنود امت منصور کا نشان تو تھا عجم کی تیغ تھا اعراب کی کمان تو تھا
وہ دن ہیں یاد کہ سسلی میں ضوفشاں تو تھا وہاں وہاں رہے ہم بھی جہاں جہاں تو تھا
بلند ناز سے تھی مجھ غریب کی گردن
تھی تیری تیغ کے نیچے صلیب کی گردن

تو سامنے تھا اٹھائے تھا کوہ طارق سر طریف میں تری پرچھائیں ناؤ کا منظر

تھا چشم منتظر اشبیلیہ کا ہر گل تر!　　تو مسکراتا تھا دیوار قصر حمرا پر

کبھی تو قلزم ظلمات جھیلتے دیکھا
کبھی بحیرۂ زریں میں کھیلتے دیکھا

ہلال سر تو اٹھا مفت شرمسار ہے تو　　ہماری سیرت اولیٰ کی یادگار ہے تو
شریک عسرت و آلام بادہ خوار ہے تو　　صفت یہ کم نہیں تیری کہ وضعدار ہے تو

شریک کون تھا قید فرنگ کے غم میں
کوئی نہ جا سکا تو ہی پہنچا فورٹ ولیم[عہ] میں

ڈھلا ہوا اترا تاج اور بڑھے ہوئے سر بال　　تھا ناخن سر انگشت تیری کا ہلال
سفید درد سے منہ ضبط غم سے آنکھیں لال　　نظر حدود میں دیوار کی وطن میں خیال

شفق میں شام کی تھا خون آرزو اپنا
دکھائی دیتا تھا تاروں میں لکھنؤ اپنا

وہ قید خانۂ غم لکھنؤ کے سلطاں کا　　وہ اڑتا رنگ کہ بجھتا چراغ زنداں کا
وہ دھمکیاں وہ شب عید چاک داماں کا　　تھا انتظار سر شب سے صبح قرباں کا

ہجوم غم سے نہ موقع تھا سر اٹھانے کا
دریچہ کھل گیا ناگاہ قید خانے کا

ہلال سامنے خم ہو کے جھلملانے لگا　　سلام لکھنؤ والوں کا یاد آنے لگا
فلک پہ چاند خبر عید کی سنانے لگا　　ہنسی نہ آئی مگر شاہ مسکرانے لگا

عجب نہیں جو تصنع تھا مسکرانے میں
ہوئی تھی پہلے پہل عید قید خانے میں

کہا ہلال سے ہمدرد تو ہی سچا ہے　　اسیر کے لیے پیغام عید لایا ہے
ہے سمت غرب وطن تو وطن سے آیا ہے　　سنا ہے کچھ مرا برجیس قدر کیسا ہے

عہ جان عالم واجد علی شاہ مرحوم کا قید خانہ کلکتہ میں۔

ہے افتراق وجدائی ہمارے پیاروں میں
تو شاد ہو کہ تری عید ہے ستاروں میں

جہاں میں ہم سا کوئی بے نوا غریب نہ ہو — ہلال سر پہ ہو پہلو نشیں حبیب نہ ہو
عزیز ودور ہوں فرزند بھی قریب نہ ہو — ہمارے بعد کسی کو یہ دن نصیب نہ ہو

یہ کہدے اُس سے جو بھولے سے ہم کو یاد کرے
کوئی کسی پہ نہ دنیا میں اعتماد کرے

بتا تو حال وطن ہم کو آج کیسا ہے — مریض کیسے ہیں طرز علاج کیسا ہے
نئے رسوم ہیں کیا کیا رواج کیسا ہے — جو ہم سے روٹھے تھے ان کا مزاج کیسا ہے

وہ اب تو خوش ہیں جو غیروں کو ساز گار بنے
امیر کتنے بنے کتنے تاجدار بنے

ترانہ ہندو مسلم کا گانا اب بھی ہے — چمن میں بلبل وگل کا ٹھکانا اب بھی ہے
وہ میل جول وفا کا ترانہ اب بھی ہے — جو ہم نے چھیڑا تھا کل وہ زمانہ اب بھی ہے

تھے جھوٹے قصے جہاں مرے عیش خانے کے
سُنا ہے اب وہیں کالج ہیں ناچ گانے کے

مصاحبوں کی بدلتی ہیں باریاں اب بھی — نکلتی ہیں امرا کی سواریاں اب بھی
سپاہیوں میں ہیں جرأت شعاریاں اب بھی — ہیں اپنے قبضے میں اپنی کٹاریاں اب بھی

فن سپاہ گری اب بھی کام آتا ہے
کبھی فنون شرافت کا نام آتا ہے

جو کل تھیں آج بھی کیچن ہیں ویسی ہی گلیاں — وہی برستا ہے ہُن آسمان ہے زر افشاں
ہے نرخ غلّہ کا سستا کہ ہوگیا ہے گراں — ہے اب بھی مفت جو بٹتا تھا میوۂ بستاں

ہمارے عہد میں منحوس سال پڑتا تھا
وہ اب تو پڑتا نہ ہوگا جو کال پڑتا تھا

ہزاروں ڈیوڑھیاں ہوں گی ہزاروں سرکاریں   جو خشت کی تھیں وہ سونے کی ہونگی دیواریں
کمال والوں سے لبریز ہونگی بازاریں   بلند ہوں گی حکومت کے فیض کی دھاریں

تمام کوچے معترا فقیر سے ہوں گے
ہزاروں اب تو انیس و دبیر سے ہوں گے

رفیع ذہن مکیں ہیں کہ ہیں مکاں اونچے   امیر خود بھی ہیں اونچے کہ ہیں نشان اونچے
مہاجن اونچے ہیں یا ہیں علوم داں اونچے   زمیں بلند ہوئی یا ہیں آسماں اونچے

نہ یہ سُنا کہ ہیں کالج میں ماسٹر کتنے
یہ راز کہہ کہ وطن میں ہیں نامور کتنے

ملے جلے ہوئے ہیں شیخ و برہمن اب بھی   ہیں تختہ بند فن و علم کے چمن اب بھی
جمی ہوئی شعرا کی ہے انجمن اب بھی   ہے کوٹھے کوٹھے پہ وہ جلوۂ سخن اب بھی

وہ کم ہیں لوگ جو دل پر نگاہ کرتے ہیں
اب آہ کرتے ہیں شہری کہ واہ کرتے ہیں

وہی ہے دھوم دھڑکا وہی بہاری عید   وطن میں ہے اُسی شوکت سے اب بھی جاری عید
خدا کا شکر خوشی سے اگر گزاری عید   وہ ہم ہی جانتے ہیں جیسی ہے ہماری عید

جو اپنا چھن گیا نام اُس کا لے نہیں سکتے
ترے سلام پہ عیدی بھی دے نہیں سکتے

(شاعر لکھنوی)

"انگڑائی"

خان بہادر جعفر علی خان صاحب (اثر)

موج مے رنگ کے طوفان میں غلطاں دیکھی شمع فانوس بلوریں میں فروزاں دیکھی
شبنمی بازوؤں سے صبح پرافشاں دیکھی
میں نے انگڑائی تری جانِ گلستاں دیکھی

پھول کھلنے لگے اور خواب سے خوشبو جاگی رسمساتی ہوئی اک ناز سے جب تو جاگی
کیف میں ڈوبی ہوئی روح بہاراں دیکھی
میں نے انگڑائی تری جانِ گلستاں دیکھی

بے تکلف گل عارض پہ شفق پھول گئی! غنچۂ گل کو مہک اور لہک بھول گئی
پیار سے تکتی ہوئی نرگس حیراں دیکھی
میں نے انگڑائی تری جانِ گلستاں دیکھی

پھول بے خود ہوئے اور غنچوں نے سر جوڑ دیئے غنچے بدمست ہوئے، بند قبا توڑ دیئے
نکہت آوارگی زلفِ پریشاں دیکھی
میں نے انگڑائی تری جانِ گلستاں دیکھی

قطعہ

شنبہ سے تا بہ جمعہ ہیں روز کے واہیات دن
ایک طرح کے ماہ و سال ایک طرح کے رات دن
دل ہے مرید نو خیال اور جہان کا ہے یہ حال
ساٹھ برس گزر گئے کٹ نہ سکے یہ سات دن

(شاعر)

"نغمۂ محبت"

(نواب عسکری حسن صاحب گلزار باغ پٹنہ)

محبت کے نغمے سنائے چلا جا — کنول میرے دل کا کھلائے چلا جا
ترے صدقے مطرب تو گائے چلا جا

محبت خدا ہے، خدا ہے محبت — اسی میں ہے پوشیدہ ساری حقیقت
یہی ساز ہر دم بجائے چلا جا

محبت ہے سرمایۂ زندگانی — محبت ہے گنجینۂ جاودانی
محبت کی دھن من لٹائے چلا جا

محبت کا دنیا میں ہے بول بالا — محبت کا ہے دونوں جگ میں اُجالا
محبت کا دیپک جلائے چلا جا

محبت کو رہبر بنانا پڑے گا — محبت کے رستے پہ آنا پڑے گا
یہ بھٹکے ہوؤں کو جتائے چلا جا

محبت کے مندر میں سر کو جھکا کر — یہ دیوتا سے اے عسکری التجا کر
میری آتما کو جگائے چلا جا

رباعی

پیری نے عجب دیا ٹھکانا مجھ کو
ناچیز سمجھتا ہے زمانہ مجھ کو
کل آئینہ کہتا تھا قسم [illegible]
غیرت ہو تو اب منہ نہ دکھانا مجھ کو

شائق لکھنوی

"محبت"

(احسن طباطبائی لکھنؤ ایم اے آنرس)

محبت کیف روحانی ہی اور اظہار سے بالا
محبت ایک جذبہ ہی مگر گفتار سے بالا

محبت دیدۂ دل سے حجابوں کو اٹھاتی ہی
محبت آدمی کو اصل میں انساں بناتی ہی

محبت زندگی کا راز ہی ہستی کا حاصل ہی
حیات جاودانی کی یہی پر کیف منزل ہی

محبت کارفرما جب ہوئی تخلیق انساں میں
بہار بے خزاں آئی تمنا کے گلستاں میں

محبت ہو تو عالم نور سے معمور ہوتا ہے
محبت کرنے والا دل چراغ طور ہوتا ہی

محبت دل کو یوں لذت کش آزار کرتی ہی
محبت روح کے احساس کو بیدار کرتی ہی

محبت نے کیا پیدا وہ عزم مستقل دل میں
جو کام آتا ہی ہر انساں کے ہر دشوار منزل میں

محبت سے مزے لیتا ہی انساں زندگانی کے
محبت کھولتی ہے در حیات جاودانی کے

محبت گر نہ ہوتی زندگی برباد ہو جاتی
فنا ساری بہار گلشن ایجاد ہو جاتی

محبت ہی شمیم جاں فزا گلزار ہستی کی
محبت آزمائش بے خود و جلوہ کی مستی کی

محبت فخر انساں ہی محبت ناز ہستی ہے
یہ وہ رفعت ہی جس کے سامنے ہر اوج پستی ہی

محبت میں جو غافل ہی وہ یوں ہشیار رہتا ہی
جفا پر شکر کرنے کے لیے تیار رہتا ہے

محبت بخشتی ہی نعمت تسکین روحانی
رہا محروم اس لذت سے ہر محو تن آسانی

محبت ہی ازل سے تا ابد ہی اس کی پہنائی
محبت نے سکھائی کوئے جاناں میں جبیں سائی

محبت غم سے بالا ہی، محبت اوج امکاں ہی
خزاں جس میں نہیں آتی یہ وہ دلکش گلستاں ہی

محبت وہ شراب تند ہی جس کا ہر اک جرعا
ازل سے تا ابد ہشیار رہنے ہی نہیں دیتا

محبت بیخودی کے بھیس میں وہ ہوشیاری ہی
جو اہل دل کو حاصل ہی جو اہل دل پہ طاری ہی

محبت ہی سے احسن دلکشی ہی زندگانی میں
نہ ہوتی یہ تو ہم دم بھر نہ رہتے دار فانی میں

(منظر لکھنوی)

جان بھی لے لے جنوں گر رحم امکاں میں نہیں
اب تو کچھ پہچان داماں و گریباں میں نہیں

کلیاں جھولی میں نہیں یا پھول داماں میں نہیں
غور سے دیکھو تو کیا گور غریباں میں نہیں

پھول میرے تھے کبھی، غنچے مرے، کلیاں مری
آج میرے نام کا کانٹا گلستاں میں نہیں

دامن دل کے بھی ہوں ٹکڑے تو ہو لطف جنوں
چاک کو کہئیے تو وہ کس کے گریباں میں نہیں

خلق سے راز غم الفت چھپانے کے لیے
رو رہا ہوں یوں کہ آنسو چشم گریاں میں نہیں

فصل گل کے ساتھ رخصت ہو گیا جوش جنوں
اب کوئی آن بن مرے دست و گریباں میں نہیں

خاک دل پہ آ کے وہ آنسو بہا جایا کریں
کیا اب اتنا بھی مرا حق کوئے جاناں میں نہیں

قوت صبر و سکوں بھی طاقت شیون بھی ہو
رہ گئی تاثیر وہ منظر کے امکاں میں نہیں

اسرار سخن

(رازؔ یزدانی)

کسی کے ہوش کو ہی یہ بھی حوصلا کہ نہیں
کوئی جنون کی زحمت اُٹھائے گا کہ ن

سزا کو جھیلنے والے یہ سوچتا ہے گناہ
کوئی قصور بھی تجھ سے کبھی ہوا کہ نہیں

ترے عتاب پہ رونا بڑا قصور
ترے عتاب پہ ہنسنا بھی ہے روا کہ

ہر ایک شے کا تماشا گناہ تھا لیکن
سوال یہ ہے کہ میں تجکو ڈھونڈھتا کہ نہیں

قدم قدم پہ ٹھہر کر یہ غور کرتا ہو
یہاں کسی نے مجھے آسرا دیا کہ

وفا تو خیر۔ بڑی کشمکش ابھی یہ ہے
کہ وہ جفا کی بھی زحمت اُٹھائے گا کہ نہیں

جہاں میں رازؔ تری درد کی پکار ہوں
کسی طرف سے بھی آتی ہے کچھ صدا کہ ن

مولانا سید اولاد حسین صاحب شاعر ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے یوسفی پریس فرنگی محل لکھنؤ سے چھپوا کر دفتر ہمراز